ماہنامہ

انذار

Inzaar

مدیر: ابو یحییٰ

نومبر ۲۰۲۲

www.inzaar.pk

November 2022

کردار نفع و نقصان پر
صحیح و غلط کو ترجیح دینے کا نام ہے

Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: facebook.com/inzaartheorg

Join us on YouTube youtube.com/inzaar-global

WhatsApp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from WhatsApp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to **info@inzaar.org** and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD

BY THAT TIME

Author: Abu Yahya

- ☆ Part Two of Abu Yahya's globally famous "When Life Begins".
- ☆ A Book that stopped innumerable steps towards Atheism.
- ☆ An Infidel girl's journey to find truth.
- ☆ A Believer's account whose life was nothing but service to God.
- ☆ An Irrefutable proof of the existence of God and Doomsday.
- ☆ A narrative of the truth of Messengers of God and their eras.
- ☆ Answers every question of Atheists and Non-Believers.
- ☆ A book that will transform your faith into unshakable belief.

قیمت 500 روپے

رسالے کے قارئین رعایت کے ساتھ گھر بیٹھے حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں:

رابطہ : 0332-3051201

ای میل: globalinzaar@gmail.com

web: www.inzaar.pk

ماہنامہ

اِنذار

نومبر 2022ء ربیع الثانی 1444ھ

جلد 10 شمارہ 11

مدیر:
ابویحییٰ ریحان احمد یوسفی

مدیر انتظامی:
غازی عالمگیر

سرکولیشن مینیجر:
وارث رضا

معاون مدیر:
عابد علی، بنت فاطمہ،
سحر شاہ، عظمیٰ عنبرین

معاونین:
محمد شفیق، محمود مرزا

فی شمارہ ــــ 50 روپے

سالانہ (بذریعہ رجسٹری) صرف 1000 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر (VP) یا اکاؤنٹ)

ابویحییٰ کے قلم سے

سلاطین کا سبق		02
قوم لوط اور ان کی عدالتیں		03
زندہ خدا اور مردہ انسان		04
گرمی، سردی، اور ایمان		05
تقسیم در تقسیم		07
ٹرانس جینڈر کا مسئلہ		10
ایران میں حجاب کا مسئلہ		14
کلمات ذکر کی حقیقت	مولانا وحید الدین خان	18
بے معنی مسائل	مولانا وحید الدین خان	20
مشرقی عرب کی شعری روایت	محمد حسن الیاس	21
ایک اچھوت پاکستانی	عظیم الرحمٰن عثمانی	27
نیت	شمائلہ عثمان	30
ڈیزائننگ ہر طرف	بلال الرشید	33
برصغیر اور دعوت دین کا طریقہ کار (7)	ڈاکٹر ریحان احمد یوسفی (ابویحییٰ)	36
اللہ رفیق اعلیٰ	پروین سلطانہ حناؔ	44

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.pk

سلاطین کا سبق

خلافت عثمانیہ کا یہ اعزاز ہے کہ اس نے چھ صدیوں تک دنیا کے تین براعظموں پر اپنا اقتدار قائم کیا۔ ان کا اقتدار ایک ہی خاندان کا اقتدار تھا جس کے آخری حکمران سلطان عبدالمجید ثانی تھے۔ ایک عظیم سلطنت کا اقتدار کھونے کے بعد وہ جلاوطن کر دیے گئے اور خواہش کے باوجود انھیں ان کے وطن میں دفن کیے جانے کی اجازت بھی نہ ملی۔ یوں ساری مسلم دنیا کا حکمران جلاوطنی میں بے گھری اور غربت کے عذاب سے گزرا۔

ان کی اکلوتی صاحبزادی درشہوار سلطان، نظام حیدرآباد عثمان علی خان کی بہو بنیں جو صرف ایک نواب ہی نہیں بلکہ دنیا کے دولت مند فرد بھی تھے۔ خود شاہزادی صاحبہ کو اپنے زمانے کی حسین ترین خاتون سمجھا جاتا تھا۔ تاہم شہزادی صاحبہ کو مزاج کے اختلافات کی بنا پر چند برس بعد شوہر سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ نظام عثمان علی خان کی ریاست بھی 1948 میں ختم ہوگئی۔

سلطان عبدالمجید، نظام عثمان علی خان اور شہزادی درشہوار جیسے لوگوں کا شمار ان لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جنھیں دنیا میں سب سے زیادہ ملا اور انھیں اس سب سے محروم ہونا پڑا۔ یہ ایک سبق ہے کہ خدا کی یہ دنیا ابدی طور پر پانے کی جگہ نہیں بلکہ پانے کے بعد کھونے کی جگہ ہے جہاں آخر کار موت سب کچھ چھین کر لے جاتی ہے۔

تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر یہ خصوصی کرم کیا ہے کہ محرومی کی اس دنیا میں کوئی بندہ اگر کسی بھی نعمت سے محروم ہونے کے بعد صبر کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کا اجرِ بے حساب اسے روزِ قیامت عطا کیا جائے گا۔ محروم ہونے والے نے اگر صبر کر لیا تو آخرت میں اسے اس سے کہیں بڑھ کر بدلہ ملے گا جتنا اس نے کھویا تھا۔ یہ محرومی کا وہ فائدہ ہے جو انسان کی سمجھ میں آجائے تو اسے کوئی دکھ نہیں ہوگا، چاہے وہ کسی سلطنت ہی سے محروم کیوں نہ ہوجائے۔

قوم لوط اور ان کی عدالتیں

عام طور پر قوم لوط اپنی ہم جنس پرستی کی وجہ سے مشہور ہے۔ تاہم قرآن مجید بتاتا ہے کہ وہ مجموعی طور پر ایک انتہائی مفسد قوم تھی، (العنکبوت 30:29)۔ اس فساد کی انتہا یہ تھی کہ وہ اپنے مہمانوں کی جان، مال، آبرو کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ اس حوالے سے ایک بہت دلچسپ واقعہ ہمارے مفسرین نقل کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خادم کو بھتیجے لوط علیہ السلام کی خیریت معلوم کرنے ان کے شہر سدوم بھیجا۔ خادم سدوم پہنچا تو ایک سدومی نے پتھر سے اس کا سر پھاڑ دیا اور پھر اسے کھینچ کر عدالت لے گیا۔

عدالت میں اس نے مقدمہ کیا کہ میں نے اس اجنبی کا سر سرخ کیا ہے، چنانچہ مجھے بال رنگنے کا معاوضہ دلایا جائے۔ عدالت نے یہ دلیل سن کر سدومی کے حق میں فیصلہ کیا اور خادم کو حکم دیا کہ وہ سدومی کو سر رنگنے کا معاوضہ دے۔ یہ سن کر خادم کو غصہ آ گیا، اس نے ایک پتھر اٹھا کر جج کا سر پھاڑا اور کہا کہ میری جو اجرت بنتی ہو، وہ اس کو دے دینا۔ یہ کہہ کر وہ بھاگ آیا۔

یہ واقعہ صحیح ہے یا غلط، یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ جس معاشرے میں عدالتیں اس طرح فیصلے کرنے لگیں، وہاں ایک وقت وہ آتا ہے جب لوگ ہاتھوں میں پتھر اٹھا لیتے ہیں۔ اس کے بعد معزز جج صاحبان کے سر پھٹنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔

حضرت علی کی طرف اس قول کی نسبت درست ہو یا غلط لیکن یہ قول قوموں کی سیاسی اور عدالتی تاریخ کے بارے میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے کہ سلطنتیں کفر کے ساتھ چل سکتی ہیں، ظلم کے ساتھ نہیں۔ سنا ہے کہ کسی ملک میں عدالتوں کے باہر قرآن کی کوئی آیت لگی ہوتی ہے۔ لوگ خدا کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتے، اس لیے بہتر ہوگا کہ حضرت علی کا یہ قول وہاں لگا دینا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ مکمل تباہی سے پہلے شاید کسی کو ہوش آ جائے۔

زندہ خدااور مردہ انسان

انسان خدا کو کیوں نہیں پاتا، یہ میری زندگی کے اہم ترین سوالوں میں سے ایک رہا ہے۔ ساری زندگی لگانے کے بعد اس کا جواب یہ سمجھ میں آیا ہے کہ خدا اِس دنیا میں کبھی خود کو ان لوگوں کے سامنے بے نقاب نہیں کرتا جنھوں نے اپنے دل کو غلافوں میں بند کر رکھا ہے۔

کچھ لوگوں کا غلاف ان کے مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصّبات ہوتے ہیں، کچھ لوگوں کا غلاف ان کے سیاسی تعصّبات ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا غلاف اپنی بڑائی کا احساس ہوتا ہے اور کچھ کا دنیا کی محبت۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ غیر اللہ کی ہستی ہوتی ہے اور کچھ لوگوں کے لیے یہ اپنے علما، اکابر اور لیڈر ہوتے ہیں۔

سو خدا کو پانا ہے تو اپنا غلاف اتاریے، تقویٰ کا لباس پہنیے، حق پرستی کا سرمہ لگایئے، محبت کی دستار باندھیے اور پھر دیکھیے کہ خدا کیسے آپ کی زندگی میں جلوہ گر ہوگا۔ وہ آپ کی ہر جنگ لڑے گا۔ وہ آپ کے ہر دشمن سے آپ کی حفاظت کرے گا۔ وہ زندگی کے ہر طوفان سے آپ کی کشتی کو نکال باہر کرے گا۔

جب آپ خدا کا تجربہ کرلیں گے تو پھر آپ کی نظر میں کوئی نہیں جچے گا۔ پھر آپ اس کے لیے اپنے ہر جذبے، ہر خواہش، ہر تعصب کو کچل دیں گے۔ آپ خوشی و غضب میں ہمیشہ حق بات کریں گے۔ آپ چھپے اور ظاہر ہر حال میں خدا کے حکم کی پابندی کریں گے۔ آپ فقر و غنا میں یکساں طور پر توازن رکھیں گے۔ پھر آپ پوچھیں گے کہ کون ہیں وہ جنھیں خدا نظر نہیں آتا؟ آپ جان لیں گے کہ سوائے اندھوں اور مردوں کے خدا ہر کسی کو نظر آتا ہے۔ رہے مردے اور اندھے تو انھیں بھی خدا نظر آئے گا، اس دن جب سارے مردے زندہ کر دیے جائیں گے۔ سو اس دن کے آنے سے پہلے خدا کو پالیں کہ زندہ خدا کو پانے کا یہ موقع بہت جلد ختم ہونے کو ہے۔

گرمی، سردی اور ایمان

کچھ عرصے قبل ایک صاحب نے اپنا ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ وہ سخت گرمیوں کے دنوں میں بال کٹوانے گئے۔ دکان میں عام طور پر اے سی چلتا تھا، اس لیے اس دکان میں باہر کی تازہ ہوا کا انتظام نہ تھا۔ مگر اس وقت لائٹ چلی گئی اور کسی وجہ سے جنریٹر بھی نہیں چل رہا تھا۔ بال کٹوانے کے عمل میں ایک کپڑا اضافی طور پر قمیض پر ڈال دیا جاتا ہے تاکہ کپڑے بال گرنے سے خراب نہ ہوں۔ ان کے ساتھ بھی یہی کیا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بال کٹواتے ہوئے انھیں گرمی کے مارے شدید پسینے آنے لگے۔ عین اسی وقت انھیں نیشنل جیوگرافک پر دیکھا ہوا ایک ٹی وی پروگرام یاد آیا جس میں یہ تجربہ کیا گیا تھا کہ انتہائی سرد کمرے میں پہلے کچھ لوگوں کو بٹھایا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ان کے لیے وہاں بیٹھنا ناممکن ہوگیا تھا۔ پھر انھی لوگوں کو کچھ دنوں بعد اسی کمرے میں اس ہدایت کے ساتھ بٹھایا گیا کہ وہ آنکھیں بند کر کے یہ سوچتے رہیں کہ یہاں بہت شدید گرمی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ لوگ بہت دیر تک اُس شدید ٹھنڈ کو برداشت کرنے کے قابل ہوگئے۔

انھوں نے اس وقت اسی تجربے کو خود پر دہرانے کا فیصلہ کیا اور آنکھیں بند کر کے یہ سوچنے لگے کہ یہاں شدید ٹھنڈ ہو رہی ہے اور یہ سردی ان کے رگ و پے میں سرائیت کرتی جا رہی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسا کرنے کے چند منٹ کے اندر ہی ان کو گرمی لگنا بند ہوگئی۔ پسینے بہنے رک گئے اور وہ اطمینان کے ساتھ بال کٹوا کر گھر واپس آئے۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ انسانی ذہن میں اپنے ماحول اور اس سے پیدا ہونے والے احساسات اور جذبات پر قابو پانے کی کتنی غیر معمولی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس صلاحیت کو بہت سی جگہوں پر استعمال کیا جا سکتا ہے، مگر اس کا سب سے مفید استعمال یہ ہے کہ اسے جنت کے حصول کی

جدو جہد میں استعمال کیا جائے۔

جنت میں جانے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان ماحول میں پائی جانے والی ساری ترغیبات کے باوجود نیکی کے راستے پر قائم رہے۔ وہ اپنی شخصیت میں موجود تعصّبات سے اوپر اٹھ کر صرف اس لیے حق کو قبول کرے کہ اس کے بغیر قیامت کی نجات ممکن نہیں ہے۔ وہ اردگرد پھیلی ہوئی مایوسی کے سمندر میں مثبت سوچ کا جزیرہ اپنے ذہن میں بنائے اور اسی پر بسیرا کر لے۔ وہ شب و روز مادی دنیا میں جینے کے باوجود آخرت کی نظر نہ آنے والی دنیا کا تصور خود پر حاوی کر لے۔ وہ مخلوقات میں زندگی گزارنے کے باوجود نظر نہ آنے والے خالق کو ذہن کی طاقت سے دیکھنے لگے۔

ایسا کرنے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان کا ایمان قرآن مجید سے بنا ہو۔ قرآن مجید وہ واحد جگہ ہے جہاں مخلوق کا نہیں خالق کا ذکر ہے، جہاں دنیا نہیں آخرت کی اہمیت بتائی جاتی ہے، جہاں نیکی کے اصل معیارات متعین طور پر طے کر دیے گئے ہیں۔ جہاں پیغمبروں کی داستانیں منفی لوگوں کے درمیان مثبت بن کر رہنا سکھاتی ہیں۔ جہاں اہل کفر کی طرح تعصّبات کے اندھیرے میں جینے کے بجائے ہدایت کی روشنی میں آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔

جو لوگ قرآن مجید کو اس طرح پا لیتے ہیں، قرآن ان کے لیے سرتاسر رہنمائی بن جاتا ہے۔ ایسے لوگ جن کا ایمان قرآن سے بنتا ہے وہ جب نماز پڑھتے ہیں اس میں خدا کے سامنے خشوع اختیار کرتے ہیں۔ وہ اپنے مال کو زیادہ سے زیادہ آخرت کے لیے خرچ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مذہبی تعصّبات، فرقہ وارانہ وابستگی اور مذہبی و سیاسی انتہا پسندی سے اٹھ کر ہمیشہ سچائی کی تلاش کرتے اور اسی کا ساتھ دیتے ہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کا ایمان پختہ اور عمل صالح ہوتا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ سراپا خیر ہوتے ہیں اور آخرت کا سارا اجر ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے۔

تقسیم در تقسیم

قیام پاکستان سے آج تک پاکستانی قوم تقسیم در تقسیم کے ایسے عمل سے گزری ہے جس نے اس میں قومی روح پیدا ہی نہیں ہونے دی۔ جس قوم میں قومی روح نہ ہو وہ دنیا میں کبھی ترقی نہیں کرسکتی بلکہ اس کے لیے اپنا وجود برقرار رکھنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔

پاکستان کا قیام ہی ہندو مسلم قوم کی تقسیم کی بنیاد پر وجود میں آیا۔ مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ جیسے نعرے اسی واقعے کا بیان ہیں۔ حد یہ ہے کہ اس دور میں امرا کو یہ تلقین کی جاتی تھی کہ ہندو کے بجائے مسلم طوائفوں کی سرپرستی کریں۔ یعنی تقسیم کا معیار نسلی طور پر مسلمان ہونا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد لسانی بنیادوں پر پہلی تقسیم سامنے آئی یعنی بنگلہ اور اردو کی بنیاد پر پھرون یونٹ سیاسی انتظام کے بعد وہ بنگالی پنجابی تقسیم میں بدل گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مغربی پاکستان میں غالب اکثریت پنجاب کی تھی۔ ایک موقع پر بھٹو صاحب نے کسی بنگالی افسر کو تھپڑ مار دیا تو اس افسر نے بعد میں روتے ہوئے کہا کہ پنجابی ہم پر بہت ظلم کرتے ہیں۔ مرحوم جسٹس جاوید اقبال نے یہ واقعہ بیان کرکے لکھا ہے کہ بھٹو سندھی تھے لیکن پھر بھی الزام پنجاب کے سر آیا۔

یہی تقسیم بعد میں بنگلہ دیش کے قیام کا سبب بن گئی۔ بعد ازاں یہی معاملہ اردو سندھی اور پھر مہاجر سندھی تقسیم کی شکل میں ستر کی دہائی میں سامنے آیا۔ جبکہ مختلف صوبائی تقسیمیں بلوچی، سندھی، پختون اور پنجابیوں کے درمیان پہلے ہی سے موجود تھیں۔ ان کے علاوہ ملک میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم بھی قیام پاکستان سے قبل ہی موجود تھی۔ دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث فرقوں کی یہ تقسیم آج بھی بڑی گہری ہے۔ مگر جو تقسیم بحث مباحثے اور کفر کے فتووں سے آگے بڑھ کر قتل و غارت گری تک پہنچی وہ شیعہ سنی تقسیم تھی جس نے اسی کی دہائی میں جنم لیا اور ملک کے طول

وعرض میں عبادت گاہوں کو خاک وخون میں بدل دیا۔

ان سیاسی اور مذہبی تقسیموں کے علاوہ طبقاتی تقسیم بھی ہمارے معاشرے میں اسی طرح موجود ہے جس طرح دیگر معاشروں میں موجود ہے۔ تاہم کمیونزم کے زوال کی وجہ سے یہ کسی تصادم میں تبدیل نہیں ہوسکی۔

پچھلی ربع صدی میں دو انتہائی خوفناک تقسیموں نے جنم لیا۔ ان میں سے پہلی مذہبی انتہا پسندی اور اعتدال پسندی کے مابین تھی۔ افغانستان کے معاملات اور بین الاقوامی حالات نے اس تقسیم کو ایک انتہائی خونی دہشت گردی میں بدل دیا تھا اور تقریباً دس برس تک اس تقسیم نے ملک کو خاک وخون میں نہلائے رکھا۔

اس تقسیم کا شرا ابھی ٹھنڈا ابھی نہیں ہوا تھا کہ پاکستان میں انتہا پسند سیاسی تقسیم نے جنم لیا۔ اس تقسیم میں ایک طرف عمران خان کے حامی اور دوسری طرف ان کے مخالفین ہیں۔ اس نوعیت کی تقسیم بھٹو صاحب کے حامیوں اور مخالفین کے درمیان بھی پیدا ہوئی تھی، مگر الیکٹرونک اور سوشل میڈیا نہ ہونے کی بنا پر اس میں اتنی وسعت اور شدت نہیں آسکی تھی۔

اس جائزے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پاکستان کے بنیادی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی معاملے پر تقسیم ہوکر گروہ بندی، تعصب، نفرت سے لے کر دہشت گردی اور جنگ وجدل ہمارے مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔ اس مسئلے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے لوگوں کو اختلاف کے آداب کبھی سکھائے گئے ہیں نہ گفتگو اور مکالمے کی فضا بنائی گئی ہے۔ نہ تجزیہ وتحلیل کا زاویہ دیا گیا ہے اور نہ حقائق کی بنیاد پر بات کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

یہاں ہر شخص جذبات کی بنیاد پر رائے قائم کرتا ہے اور جذبات کے ساتھ ہی بیان کرتا ہے۔ جذبات ظاہر ہے کہ جلد مشتعل ہوتے ہیں جو پھر انتہا پسندی، نفرت اور قتل وغارتگری میں بدلتے

ہوئے دیر نہیں لگاتے۔

لوگوں کو ایک قوم بننے کے بجائے تقسیم در تقسیم کے عمل سے کیسے گزارتے ہیں، اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ ہمارے ہاں جب انتہا پسندی اور اعتدال پسندی کے معاملے میں صف بندی ہوئی تو انتہا پسندوں کی تعداد، طاقت اور اثر ورسوخ بہت زیادہ تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اعتدال پسند منظم ہوئے اور بتدریج انتہا پسندی کو ایک درجہ میں لگام ڈال دی گئی۔

مگر جیسے ہی سیاسی انتہا پسندی نے جنم لیا یہ اعتدال پسند سیاسی بنیادوں پر ایک دوسرے کی بالکل مخالف سمتوں میں چلے گئے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ جو لوگ مذہبی اعتبار سے کسی کو بڑے شوق سے سنتے اور پڑھتے تھے، اس کے سیاسی خیالات کی بنیاد پر اس سے نفرت کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اعتدال پسند نامی مخلوق اب اس ملک سے ختم ہو چکی ہے اور دوبارہ کبھی بھی مذہبی انتہا پسندی نے سر اٹھایا تو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ان میں اتفاق اور اتحاد پیدا ہونا بہت مشکل ہوگا۔

یہی معاملہ آج پوری قوم کا ہو چکا ہے۔ آج پاکستانی قوم صرف پاسپورٹ کی حد تک ایک قوم ہے یا بہت ہوا تو ہندوستان سے کرکٹ کے کسی مقابلے میں یہ کوئی قوم بن جاتے ہیں۔ ورنہ یہ قوم صوبائی اور لسانی بنیادوں پر پنجابی، سندھی، بلوچی، پختون، مہاجر، سرائیکی؛ مذہی بنیادوں پر شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، انتہا پسند، اعتدال پسند اور سیاسی بنیادوں پر بھٹو کے حامی ومخالفین اور عمران خان کے حامی ومخالفین میں بٹی ہوئی ہے۔ جس قوم کا یہ حال ہو وہ دنیا میں کبھی ان اقوام کا مقابلہ نہیں کرسکتیں جو چاہے تعداد میں کتنی ہی کم ہو، مگر اندرونی طور پر متحد ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا سے فطری انسانی تقسیمیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ ان کے ساتھ اعتدال اور توازن کے ساتھ جینا سیکھنا چاہیے۔ بدقسمتی سے ہماری فکری قیادت نے نہ ہمیں اس طرح جینا سکھایا ہے اور نہ ہم اس طرح جینا چاہتے ہیں۔

ٹرانس جینڈر کا مسئلہ

ٹرانس جینڈر کی بحث سے متعلق کچھ اصولی باتیں ایسی ہیں جن کا سمجھنا ضروری ہے۔

پہلی یہ کہ دنیا بھر میں اس مسئلے کا تعلق ان لوگوں سے نہیں ہے جو پیدائشی طور پر مشترک صنفی اعضا رکھنے والے (Intersex) ہوں۔

دوسری یہ کہ جن مردوں کے مردانہ خصوصیات پیدا کرنے والے صنفی اعضا کسی بھی وجہ سے ختم کر دیے گئے ہوں اور جنھیں عام زبان میں خواجہ سرا (eunuch) کہا جاتا ہے، یہ لوگ اصلاً مرد ہوتے ہیں اور مرد ہی رہتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں چھوٹے بچوں کو اغوا کر کے بچپن ہی میں اس عمل سے گزارا جاتا تھا تاکہ ان میں صنفی صلاحیت کے ساتھ صنفی احساسات بھی کم از کم رہے اور وہ بادشاہوں کے حرم میں وہ خدمات سرانجام دے سکیں جن میں بازوؤں کی طاقت کی تو ضرورت ہوتی تھی، مگر صنفی طاقت اور احساس غیر مطلوب ہوتے تھے۔

اب اس مقصد کے لیے خواجہ سرا نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی حادثے، بیماری یا کسی اور وجہ سے اپنے مردانہ اعضا سے محروم ہوجاتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں معذوری پیدا ہوجاتی ہے، مگر وہ مرد ہی رہتے ہیں۔ دنیا بھر میں ٹرانس جینڈر کی بحث میں یہ لوگ بھی اصلاً شامل نہیں ہوتے۔

تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ دنیا بھر میں ٹرانس جینڈر کی بحث اصلاً ان مردوں اور عورتوں سے متعلق ہے جو جسمانی طور پر مکمل مرد یا عورت ہوتے ہیں، لیکن اپنی شناخت اپنی جسمانی صنفی اعضا کے برخلاف کرتے ہیں۔ یہ لوگ عملی زندگی میں طریقہ اور انداز و اطوار بھی انھی لوگوں کے اختیار کر لیتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ سرجری کے ذریعے سے اپنی صنفی اعضا میں تبدیلی بھی کروا لیتے ہیں۔

مغرب میں اس عمل میں جو بنیادی قانون سازی کی گئی ہے وہ اس تصور پر مبنی ہے کہ جنس اور صنف دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ جنس کا تعلق پیدائشی جسمانی اعضا سے ہوتا ہے جبکہ صنف کا تعین ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس اصول پر بچپن سے بچوں کے جنسی اعضا کے مطابق ان کی صنف کا تعین نہیں کیا جاتا بلکہ یہ ان پر چھوڑا جاتا ہے کہ وہ اپنے لیے کس صنف کو پسند کرتے ہیں۔

مغرب میں یہ ہم جنس پرستی سے ایک جدا مسئلہ ہے۔ ہم جنس پرستی میں ایک شخص کی معاشرتی شناخت نہیں بدلتی بلکہ وہ اپنی ہی جنس کے کسی فرد سے تعلق استوار کرتا ہے۔ جبکہ یہاں ایک شخص کی معاشرتی شناخت بدل رہی ہے جو ہم جنس پرستی سے آگے بڑھ کر ایک اگلا مرحلہ ہے۔

اس موقع پر یہ بھی واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ مغرب میں ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ زمانہ قدیم کا مغرب صنفی اقدار میں کسی اجتماعی انحراف کا شکار نہیں تھا۔ یہ وہ دور تھا جس میں تمام دنیا مذہبی طور پر مختلف ہونے کے باوجود خدا کی بندگی کی اساس پر کھڑی تھی۔ مگر جب جدیدیت کی فکر عام ہوئی تو اس میں خدا کی جگہ فرد نے لے لی اور بندگی کی جگہ آزادی بنیادی انسانی قدر بن گئی۔ مابعد الجدیدیت میں فرد کی خواہش سب سے بڑی انسانی قدر قرار پائی۔ چنانچہ آزادی اور خواہش کے امتزاج کے آگے شادی، خاندان، صنفی فرق جیسی اقدار جو ہمیشہ سے انسانوں کے ہاں بنیادی رہیں تھیں، ایک کے بعد ایک کر کے نشانہ بنتی چلی گئیں۔

مغرب نے اپنے ان نئے تصورات کو رائج ہی نہیں کیا بلکہ ان کے خلاف آواز اٹھانے والوں پر زندگی کا ہر دروازہ بند کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مغرب میں اس وقت قدامت پسند مسیحی اور یہودی، یہودی مسیحی اقدار (Judeo-Christian values) کے عنوان

کے تحت اس رجحان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ مغرب میں رہنے والے اپنے بھائی بہنوں کو ہم یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ مل کر ابراہیمی مذاہب کی اقدار کے تحت مشترکہ چیزوں کے لیے جدو جہد کریں۔

اس پوری تفصیل کو بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری قوم آج اس پورے مسئلے سے واقف ہوئی ہے، مگر مغرب میں یہ جنگ پچھلے دو عشروں سے جاری ہے اور ہمارے جیسے طالب علم ایک طویل عرصے سے خاموشی سے اس سماج میں یہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ ہمارے سماج میں جہاں لوگ کرنٹ افیئرز میں جیتے ہیں اور ایک ہی ہفتے میں اپنی دلچسپی کے موضوعات سیلاب سے کرکٹ اور کرکٹ سے ملکہ الزبتھ کی موت تک اس طرح بدلتے ہوں جیسے ٹی وی کے چینل کو ریموٹ سے بدلا جاتا ہے وہاں ہمارے جیسے لوگوں کو کون پڑھے اور کون سنے گا؟

جہاں لوگ فرقہ وارانہ موضوعات، مذہبی مناظروں اور سیاسی جھگڑوں اور دیگر گرما گرم موضوعات کو اپنی عقل و دانش کا موضوع بنائے ہوئے ہوں وہاں ایمان، اخلاق، تعمیر شخصیت، مثبت انداز فکر، معقولیت، اصول پسندی، اعتدال و توازن کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔

اس جملہ معترضہ سے ہٹ کر جو اصل بات ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کے لیے یہ نئی اقدار اصل انسانی اقدار بن چکی ہیں۔ وہ ان اقدار کو بالجبر دنیا سے منوا کر دم لے گا۔ پاکستان کے متعدد ملٹی نیشنل اداروں میں اس طرح کی چیزوں کی پابندی کروائی جارہی ہے۔ ہماری ہر وہ فیکٹری جو ایکسپورٹ کرتی ہے، وہ بتدریج ان چیزوں کی پابند ہوتی چلی جارہی ہے۔ ہمارے نوجوان انٹرنیٹ سے جس طرح الحاد کی گود میں جارہے ہیں، اسی طرح ہم جنس پرستی اور ٹرانس جینڈر ہونے کو بھی ترقی کی علامت سمجھ کر قبول کررہے ہیں۔ سیکولر دانش ور چونکہ بندگی کے بجائے مطلق

آزادی اور مطلق خواہش کے مغربی فکر سے متاثر ہیں، اس لیے وہ دبے لفظوں اس طرح کی چیزوں کی حمایت کرتے ہیں۔

باقی جہاں تک قانون کا تعلق ہے تو وہ بلاشبہ مغربی اقدار کے تحت بنایا گیا ہے۔ ہم احتجاج کر کے اس قانون کو تبدیل کروا بھی دیں تو زمینی حقائق نہیں بدلیں گے۔ زمینی حقائق یہ ہیں کہ ہمارے نوجوان مغربی افکار سے دن بدن متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہماری نوجوان نسل کے اعلیٰ ترین اذہان ہماری جن پرائیوٹ جامعات یا ملک سے باہر جن یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں وہاں ان میں یہ فکر و فلسفہ استدلال کی بنیاد پر منتقل کیا جا رہا ہے۔ انٹرنیٹ پر یہ سارا مواد ہر پہلو سے دستیاب ہے اور پوری قوم کی پہنچ میں ہے۔ ہم اخلاقی طور پر تباہ حال، معاشی طور پر بھکاری اور مذہبی طور پر پکے تقلید پسند ہیں۔

مغربی انحرافات کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اخلاقی طور پر مضبوط ہوں تا کہ خواہش کی بنیاد پر لوگ اپنی زندگی کے فیصلے نہ کریں۔ ہم معاشی طور پر مستحکم ہوں تا کہ مغربی مطالبات کو یکطرفہ طور پر ماننے پر مجبور نہ ہوں۔ مذہبی طور پر ہم فرقہ واریت، جمود اور انتہا پسندی سے اوپر اٹھ کر ایمان و اخلاق کو اپنا فکر و عمل بنانے والے بن جائیں۔ ہم یہ کر لیں گے تو معاملات بہت بہتر ہو جائیں گے ورنہ یہ نوشتہ دیوار ہے کہ اگلے بیس سے تیس سالوں میں ہمارے ہاں جتنے لوگ ایسے قوانین کی مخالفت کر رہے ہوں گے ان سے کہیں زیادہ ان کی حمایت کرنے والے ہوں گے جن کی پشت پر مغرب اپنی فکری قوت کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ اس کا انجام کیا ہوگا، یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایران میں حجاب کا مسئلہ

سولہ ستمبر 2022 کے دن ایران کے شہر تہران میں ایک بائیس سالہ لڑکی مہسا امینی کی ہلاکت کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب وہ ایرانی گشت ارشاد (مذہبی احکام نافذ کرنے والی) پولیس کی قید میں تھی۔ اس لڑکی کو دو دن قبل حکومتی معیارات کے مطابق حجاب نہ کرنے پر پکڑا گیا تھا۔ دیگر قیدیوں کے مطابق لڑکی کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا جبکہ پولیس نے اسے حادثاتی موت قرار دیا۔ اس کے بعد ایران میں بڑے پیمانے پر فسادات پھوٹ پڑے جن میں اب تک درجنوں لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔ ایک حالیہ واقعے میں انیس لوگوں کو پولیس نے فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔ ایران نے اس مسئلے کو عالمی سازشوں سے جوڑ دیا ہے اور غیر ملکی خبر رساں ایجنسیز کے مطابق کئی غیر ملکیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ تاہم مبصرین اسے ایرانی معاشرے میں طویل عرصے سے جاری حکومتی جبر کے خلاف ایک عوامی ردعمل قرار دے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک تین طرح کے گروہ اس وقت حکومت کے خلاف مظاہروں میں پیش پیش ہیں۔ ایک حکومتی مذہبی جبر سے تنگ لوگ جو زبردستی حجاب کرانے کے حکومتی عمل کے خلاف ہیں۔ دوسرے نسلی طور پر ایرانیوں سے جدا لوگ جیسے کرد۔ خیال رہے کہ مرنے والی لڑکی کرد تھی۔ تیسرے اقلیتی فرقے۔ زاہدان میں پولیس فائرنگ سے مرنے والے انیس لوگ سنی اقلیتی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

کچھ مبصرین کے نزدیک اب تک بڑی تعداد میں ہونے والی ہلاکتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت پوری شدت سے ان مظاہرین کو کچلنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نہتے عوام ایک حد سے زیادہ بندوقوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ مظاہرے جلد یا بدیر ختم ہو جائیں گے، مگر اتنی ہلاکتوں کے بعد عوام کی نفسیات پر گہرے اثرات چھوڑ جائیں گے جو مستقبل میں کسی بڑے انقلاب کو جنم دیں گے۔

دوسری طرف کچھ مبصرین کا خیال ہے کہ حکومتی تشدد سے عوامی ردعمل بڑھتا چلا جائے گا اور

عین ممکن ہے کہ ایران میں علما کا اقتدار ختم ہو جائے اور کوئی دوسرا نظام حکومت قائم ہو جائے۔

ہم نے قارئین کے لیے سیاسی منظر نامے کو گرچہ تفصیل سے واضح کر دیا ہے، مگر یہ ہماری دلچسپی کا موضوع نہیں ہے۔ ہمارے لیے زیادہ اہم بات یہ مذہبی معاملہ ہے کہ آیا ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ حجاب جیسے اختلافی معاملات میں سے جس تعبیر کو خود درست سمجھتی ہو اسے زبردستی عوام پر نافذ کرے۔

مسلمانوں کے مذہبی فکر نے دورِ جدید میں تین ریاستوں میں اقتدار میں جگہ حاصل کی اور تینوں جگہ انھوں نے اس معاملے میں اپنے نقطہ نظر کو بالجبر عوام پر نافذ کیا۔ افغانستان، سعودی عرب اور ایران تینوں جگہ یہی ہوا۔ ان میں سے سعودی عرب کے شاہی خاندان نے چونکہ اپنی مجموعی پالیسی بدلی ہے، اس لیے وہاں پر حکومت نے مذہبی طبقے کی مرضی کے خلاف جا کر جہاں دیگر معاملات میں سختی کا رویہ ترک کیا ہے، وہاں خواتین کے معاملے میں بھی ان کی پالیسی بدل گئی ہے۔ جیسے حجاب کے معاملے میں اب عبایا اور حجاب خواتین کے لیے لازمی نہیں رہا۔

باقی افغانستان میں طالبان اور ایران میں علما نے اپنے اقتدار میں خواتین پر اپنے مذہبی نقطہ نظر کے لحاظ سے پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور جیسا کہ شروع میں بیان ہوا کہ ایران میں موجودہ فساد کا آغاز بھی ایک خاتون کا حکومتی معیار پر حجاب لینے سے انکار سے ہوا تھا۔

تاہم جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے جہاں انسان کو مکمل آزادی دی گئی ہے۔ جنت اسی چیز کا بدلہ ہے کہ انسان اپنی مرضی سے اور بغیر کسی دباؤ کے اپنے اختیار کو اپنے مالک کے سامنے ختم کر دیتا ہے اور اس کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ کائنات میں صرف انسان کو یہ اختیار ہے کہ وہ خدا کی نافرمانی کرے اور جب وہ یہ نہیں کرتا تو خود کو خدا کی اس نعمت کا مستحق بنا لیتا ہے جو کسی اور کو نہیں دی جائے گی یعنی جنت کی ابدی بادشاہی۔

یہی پس منظر ہے جس میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ دین میں جبر نہیں ہے۔ نبیوں کی ذمہ داری صرف پہنچا دینا ہے اور سزا کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔ اہل ایمان پر بھی اپنی ہی ذمہ داری ہے۔ دوسروں کی گمراہی سے انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے کا۔ ان کا اصل مسئلہ ان کی اپنی ہدایت ہونی چاہیے۔ دوسروں کو تلقین کرنا الگ چیز ہے، لیکن کچھ ٹھونسنے کا کام اللہ نے کسی کو نہیں دیا۔

قرآن مجید میں یہ سب کچھ اتنی تفصیل اور تواتر سے بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بات کو سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں۔ تاہم لوگوں کو غلطی دو بنیادی وجوہات کی بنا پر لگتی ہے۔ ایک تاریخی معاملہ ہے اور دوسرا قرآن مجید کے کچھ احکام۔

تاریخی معاملہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ میں جہاد کے بعد دین کا غلبہ قائم ہوا۔ حتیٰ کہ سرزمین عرب میں تو یہ حکم دیا گیا کہ جو مشرک ایمان نہیں لائے گا قتل کر دیا جائے گا۔ یہ واقعہ ایک حقیقت ہے مگر اس کو قرآن مجید کے ان بیانات کے تحت سمجھنا چاہیے جن کے مطابق اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں رسول بھیج دیتے ہیں تو اتمام حجت کے بعد اسی دنیا میں منکروں پر سزا نافذ کر دیتے ہیں۔ پچھلی اقوام کو طوفان، زلزلے، آندھی، کڑک وغیرہ میں ہلاک کیا گیا جب کہ آخری دفعہ یہ سزا منکرین کو صحابہ کرام کی تلواروں سے دی گئی۔ اسی کا دوسرا جز یہ ہوتا ہے کہ ماننے والوں کو زمین میں اقتدار بطور انعام کے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے جہاد کی یہی نوعیت ہے کہ منکرین کو سزا دینا مطلوب تھا اور مومنین کو بطور انعام زمین پر غلبہ دینا مقصود تھا۔ عام لوگوں سے اس بات کا کوئی تعلق نہیں۔

قرآن مجید کے جس حکم سے لوگوں کو اس معاملے میں غلطی لگی ہے وہ امر بالمعروف ونھی عن المنکر کا حکم ہے جسے دوسری جگہ تواصوا بالحق وتواصوا بالصبر بھی کہا گیا ہے۔ مگر اس حکم کا تعلق صرف ان چیزوں سے ہے جن کا حق ہونا، معروف ہونا یا منکر ہونا ایک مسلمہ ہو۔ جیسے جھوٹ، فریب ودھوکا دہی وغیرہ کو سب غلط سمجھتے ہیں اور عدل وانصاف، رحم و ہمدردی، اور سخاوت وغیرہ کو سب

اچھا سمجھتے ہیں۔ حجاب جیسی چیزیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے اختلافی مسائل میں سے ہیں، ان کے بارے میں اپنے فہم کو دوسروں پر بالجبر نافذ کرنا اور خلاف ورزی پر قید اور تشدد کی کسی صورت کوئی گنجائش دین اسلام میں نہیں ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ امر و نھی عربی زبان میں ہر حال میں حکم دینے کے مفہوم میں نہیں آتے، ان سے مراد تلقین بھی ہوتی ہے۔ نماز اسی مفہوم میں برائی سے رکنے کی تلقین کرتی اور شیطان اسی مفہوم میں فواحش کی راہ دکھاتا ہے۔ یہ الفاظ حکم کے مفہوم میں صرف اس وقت آتے ہیں جب یہ بات کہنے والا خلاف ورزی کی صورت میں سزا کا اختیار بھی رکھتا ہو۔ مثال کے طور پر حکمران کو اپنی رعایا پر یہی اختیار حاصل ہوتا ہے اور اسی بنا پر قرآن مجید نے جب انھیں امر بالمعروف و نھی عن المنکر کا حکم دیا ہے تو اس کے ساتھ کچھ جرائم کی سزا مقرر کر کے حکمرانوں کے ذمہ لگایا ہے کہ وہ ایسے مجرموں کو سزا دیں۔ یہ سارے جرائم منکرات کے ذیل کے ہیں یعنی قتل، چوری، جراحت اور زنا۔ اسی سے نھی عن المنکر بالید کا تصور واضح ہوتا ہے کہ طاقت کے زور پر برائی سے انھی مسلمہ چیزوں کو روکا جائے گا جو انفرادی اور اجتماعی طور پر حق تلفی اور ظلم و تعدی کی نوعیت کی ہوں گی۔ یہی منکر کی تعریف ہے۔

ان میں سے ہر چیز پر ہم نے تفصیلی مضامین لکھ رکھے ہیں، جو لوگ تفصیل کے طالب ہیں وہاں دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں ہمارے پیش نظر صرف یہ توجہ دلانا تھا کہ اہل دین کا اصل کام اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ دین کو بالجبر ٹھونسنے کی گنجائش نہ نصوص میں ہے اور نہ آنے والا زمانہ اس کی کوئی گنجائش رہنے دے گا۔ بہتر ہے اہل دین انتہا پسندی اور جبر سے بچ کر اسلام کا اصل پیغام یعنی اپنے اختیار سے اپنے رب کے سامنے جھک جانے کو لوگوں تک پہنچائیں۔ یہی کرنے کا اصل کام ہے۔

مولانا وحید الدین خان

کلمات ذکر کی حقیقت

سبحان اللہ، والحمد للہ، ولا الہ الا اللہ، واللہ اکبر، ولاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ ان کلمات کے جو الفاظ ہیں وہ محض الفاظ نہیں ہیں، بلکہ وہ گہرے معانی کو بتا رہے ہیں اور یہ الفاظ اپنے انھیں گہرے معانی کے اعتبار سے مطلوب ہیں، نہ کہ محض الفاظ کے اعتبار سے، یعنی ان کا فائدہ محض ان کی لفظی تکرار میں نہیں ہے، بلکہ ان کی اسپرٹ یا ان کی معنویت کو اپنانے میں ہے۔

لاحول ولاقوہ کیا ہے۔ وہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ سبحان اللہ کیا ہے سبحان اللہ اس حقیقت کی دریافت ہے کہ خدا ہر قسم کے عیب اور نقص سے کامل طور پر پاک ہے۔ الحمد للہ کیا ہے۔ الحمد للہ دراصل یہ ہے کہ ایک صاحب معرفت آدمی اللہ کے کمالات کو دریافت کر کے اس کا شعوری اعتراف کرے۔ لا الہ الا اللہ کیا ہے۔ لا الہ الا اللہ دراصل تمام معبودوں کو رد کر کے اللہ کو معبود حقیقی کے طور پر دریافت کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اللہ اکبر کیا ہے۔ یہ وہ عارفانہ کلمہ ہے جو ایک شخص کی زبان سے اس وقت بے تابانہ طور پر نکل پڑتا ہے، جب کہ وہ تدبر کے نتیجہ میں اللہ کے مقام عظمت کو دریافت کرے۔

یہ کلمات دراصل ذکر الٰہی کے کلمات ہیں۔ ذکر کی حقیقت معرفت ہے اور معرفت الٰہی بلاشبہ سب سے بڑی نیکی ہے۔ لیکن معرفت کوئی سادہ چیز نہیں۔ معرفت سے پہلے دریافت ہے۔ دریافت سے پہلے تدبر، تدبر سے پہلے یکسوئی ہے، یکسوئی سے پہلے سنجیدگی ہے۔ آدمی سب سے پہلے سنجیدگی کا ثبوت دیتا ہے، پھر وہ اپنے ذہن کو غیر متعلق چیزوں سے یکسو کرتا ہے، اس کے بعد وہ غور وفکر کرتا ہے، جس کو تدبر کہا جاتا ہے۔ تدبر اس کو دریافت تک پہنچاتا ہے اور دریافت معرفت تک۔ سنجیدہ تفکر کے ان مراحل سے گزرنے کے بعد جب کسی انسان کو اللہ رب العالمین

کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو اس کے ذہن میں ایک فکری بھونچال آتا ہے، اس کے اندر حقیقت شناسی کا ایک سیلاب امنڈ پڑتا ہے۔ یہ ربانی کیفیت جب ایک انسان کی زبان سے بے تابانہ طور پر ظاہر ہوتی ہے تو اسی کا نام ذکر الٰہی ہے۔

یہ کلمات دراصل اس شعوری عمل کو بتاتے ہیں جو ایک صاحب ایمان کے اندر موجودہ دنیا میں جاری ہوتا ہے۔ موجودہ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ایک صاحب ایمان پر مختلف احوال اور تجربات گزرتے ہیں۔ اگر اس کے اندر ایمانی شعور زندہ ہو تو یہ تمام احوال و تجربات اس کے لیے رزق رب کا ذریعہ بنتے رہیں گے۔ آخرکار وہ اس مطلوب انسان کا درجہ حاصل کر لے گا جو آخرت میں داخلے کے لیے ایک مستحق امیدوار کی حیثیت رکھتا ہے۔

''ان سے کہو کہ آؤ میں تمھیں سناؤں تمھارے رب نے تم پر کیا چیزیں حرام کی ہیں:
یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔ اور بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی، اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم (ٹھہرایا) ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔ یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔ اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد (بلوغت) کو پہنچ جائے۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے۔ اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو، اور اللہ کے عہد کو پورا کرو، ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمھیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔ نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمھیں پراگندہ کر دیں گے۔ یہ ہے وہ وصیت جو تمھارے رب نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو۔'' (الانعام 6:153-151)

مولانا وحید الدین خان

بے معنی مسائل

حدیث میں آیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اغلوطات سے منع کیا ہے۔ اغلوطات سے مراد وہ مسائل ہیں جو واقع ہونے سے پہلے فرضی طور پر قائم کیے جاتے ہیں۔

دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے: اللہ نے تمہارے لیے قیل وقال کو اور کثرت سوال کو اور مال ضائع کرنے کو ناپسند کیا ہے۔

یہ تعلیم بے حد حکمت پر مبنی ہے۔ اگر لوگوں کے اندر یہ مزاج باقی نہ رہے تو وہ ہر بات کو بحث کا موضوع بنائیں گے، ہر چیز کو منطق کے پیمانہ سے ناپیں گے۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوگا کہ دین کا اصل سرا چھوٹ جائے گا اور بے معنی مسائل پر لفظی بحث کے سوا ان کے پاس اور کچھ باقی نہ رہے گا خدا کا سادہ دین انسانی اضافوں کے بعد مشکل اور پیچیدہ دین ہو کر رہ جائے گا۔

ایک مثال لیجئے۔ ایک مرتبہ کسی نے ایک آدمی سے پوچھا کیا تم مسلمان ہو۔ اس کی زبان سے نکلا: انا مومن ان شا اللہ (خدا نے چاہا تو میں مومن ہوں) یہ بات بحث کی نہ تھی۔ مگر ماہرین فقہ نے غیر ضروری طور پر اس کو بحث کا موضوع بنایا۔ اب ان کے درمیان یہ بحث چل پڑی کہ اس قسم کا جواب دینا جائز ہے یا ناجائز۔ ایک گروہ نے کہا کہ جائز ہے۔ کیونکہ کسی کا مومن ہونا یا نہ ہونا خدا کی مشیت ہی پر ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ ناجائز ہے۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنے ایمان میں شک ہے۔

شافعی مسلک کے لوگ اس کے قائل تھے کہ انا مومن ان شا اللہ کہنا جائز ہے۔ اس کے برعکس حنفی مسلک کے لوگوں کا کہنا تھا کہ ایسا کہنا جائز نہیں۔ جب یہ بحث بڑھی تو یہ سوال پیدا ہو گیا کہ ایسے لوگوں کے درمیان نکاح درست ہوگا یا نہیں۔ ایک گروہ نے کہا کہ حنفی عورت کا نکاح شافعی مرد کے ساتھ جائز نہیں۔ کیونکہ اس کو اس کے ایمان پر شک ہے۔ دوسروں کا فتویٰ یہ تھا کہ ذمی عورت پر قیاس کرتے ہوئے نکاح درست ہوگا۔

اس سے اندازہ کیجیے کہ غیر ضروری بحثوں میں پڑنے کے بعد صراط مستقیم کا سرا کس طرح چھوٹ جاتا ہے۔

محمد حسن الیاس

مشرقی عرب کی شعری روایت

[ذیل میں مولانا محمد حسن الیاس صاحب کا ایک مضمون نقل کیا جا رہا ہے جس میں نزول قرآن مجید کے وقت رائج عربی کا دیگر زبانوں اور بعد کے زمانے کی عربی زبان سے ایک تقابل کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے فرزدوق جو عہد خلافت راشدہ میں پیدا ہونے والے ایک شاعر تھے، ان کے اشعار کا انیسویں صدی کے ایک جدید عراقی شاعر سید جعفر الحلی کی شاعری سے تقابل کیا گیا ہے۔

اس تقابل کی علمی و ادبی حیثیت اپنی جگہ ہے، مگر اس سے قرآن مجید کا یہ اعجازی پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ تمام عرب شاعر مل کر بھی جس عربی زبان سے چند مضامین، محدود اسالیب کے ساتھ بیان کر رہے تھے، قرآن مجید نے اسی زبان کو اٹھایا اور عرب کے صحرا نشینوں کے سامنے اسالیب و مضامین کی وہ دنیا رکھ دی جو ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔

قریش اسی صحرا میں رہتے تھے جس میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم زندگی گزارتے تھے اور وہی زبان بولتے تھے جو آپ کی زبان تھی۔ وہی آب و ہوا، وہی ماحول، وہی سماج و معیشت، وہی مسائل و معاملات جن میں دونوں فریق موجود تھے، مگر ایک روز بغیر کسی پس منظر کے آپ علیہ السلام نے انھی کی زبان میں وہ کلام پیش کیا جس کی نظیر اس سے قبل موجود نہ تھی۔ قرآن مجید کا یہی وہ اعجازی پہلو تھا جس نے پورے عرب کو لاجواب کر دیا تھا۔ آج اعجاز قرآنی کے اس پہلو کو سمجھنے والے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں، لیکن امید ہے کہ مولانا حسن صاحب کا یہ مضمون اور اس پر ہمارا یہ تبصرہ اہل ذوق کو قرآن مجید کے اس معجزاتی پہلو کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ ابو یحییٰ]

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے ایک مضمون میں عربی اور فارسی شاعری کا تقابل پیش کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ عربی شاعری یقینا اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے لیکن فارسی شاعری بہت سے پہلوؤں سے ممتاز ہے۔ شبلی کہتے ہیں کہ مثنوی، فلسفہ، تصوف اور جدتِ خیال، اِن میں فارسی شاعری نہ صرف منفرد ہے بلکہ عربی کا شعری ذخیرہ اِس صنف سے خالی ہے۔

اپنے اِس نقطۂ نظر کی تائید میں وہ چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً جب عرب شاعر محبوب

کے جمال کو آخری انتہا تک پہنچانا چاہتا ہے تو زیادہ سے زیادہ وہ اُسے انگھوٹھی کے حلقے سے تشبیہ دے دیتا ہے۔ اِس کے برعکس، فارسی شاعری کی قوتِ تخیل اسے بندرج، گوہر، چشمہ نوش، پستہ، غنچہ، ذرۂ جوہر جیسی علامات سے ظاہر کرتا ہے، اوراس کا خزانہ تشبیہ خالی نہیں ہوتا۔

دورِ حاضر میں عربی زبان و بیان پر نظر رکھنے والے ایک بڑے عالم ڈاکٹر خورشید رضوی نے اردواور عربی شاعری کے اسلوبِ بیان کو تقابل کی ایک اور مثال سے واضح کرتے ہوئے بتایا کہ جہاں اردو زبان میں الفت کے تعلق کو بیان کیا جائے تو اسے محبت کے ''دھاگوں'' میں بندھنے سے تشبیہ دی جاتی ہے، وہیں عربی زبان میں یہی معاملہ دھاگے کے بجائے ''رسی'' میں ڈھل جائے گا، جس سے اردو کی نزاکت اور لطافت، نیز عربی زبان میں موجود شدت و کثافت واضح ہوتی ہے۔

راقم نے چند سال پہلے شبلی کا یہ مضمون اپنے استاد دکتور محمود مصری کے سامنے رکھا تو اُنھوں نے شبلی کی اس بات کو محل نظر قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ ندرتِ خیال کا ایک اہم عنصر ماحول اور معیشت ہوتی ہے۔ عرب شاعری کا وہ حصہ جو غیر متمدن عہد کا ہے، لوگ اِس جانب زیادہ التفات کرتے ہیں۔ اِس خطے میں زندگی دشوار تھی، وسائل محدود تھے، اور طبیعتیں سخت تھیں۔

عرب جب مغرب میں پہنچے ہیں، جہاں خدا کی تخلیق کا حسن اور کائنات کی کرشمہ سازیاں جلوہ افروز تھیں، ہر جانب بچھے ہوئے سبزہ زار، نیلی ندیاں، بہتے پانی کا شور، موسم بہار، میٹھے میوے، جنگلوں کا دل چیرتے جھرمٹ، بل کھاتی چراہ گاہیں، محتشم جامہ زیبی، آباد شہر اور متمدن سلطنت ایسے ماحول میں وہاں کی شاعری کا رنگ ہی مختلف نظر آتا ہے۔ چنانچہ وہاں نہ صرف خیال کی ندرت ہے بلکہ الفاظ کی ترکیب، محاورے اور اسلوبِ بیان میں بھی ملائمت ہے۔ وہ عرب جو مغرب (اندلس) میں آباد ہوئے، ان کی شاعری سے فارسی شاعری کا موازنہ تو قابل فہم ہے، لیکن مشرقی عرب کی شعری روایت سے اِس طرح کا موازنہ کرنا درست نہیں۔

اِس پہلو سے دکتور کی یہ بات قابل غور ہے۔ عرب شاعری کی تاریخ کو بے آب و گیاہ خطہ تک محدود کر کے دیکھا جائے تو علامہ شبلی کی بات ٹھیک نظر آتی ہے لیکن اگر دورِ متوسط، خصوصاً

اندلس میں عربوں کے جانے کے بعد کی ادبی روایت کا استقصا کیا جائے تو ندرتِ خیال کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جس سے عرب شاعری محروم ہو۔ اِس بات کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ جزیرہ نما کے ادب میں بیان اوصاف کے اسالیب بہت محدود ہیں، جسے شاعر شدتِ بیان اور قوتِ الفاظ سے نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اہل عرب اِس پہلو کو بھی اپنا امتیاز بتاتے ہیں کہ لغات کا ذخیرہ اتنا وسیع ہے کہ ایک ایک چیز کے لیے سوسو نام ہیں۔ لیکن یہ بات زبان کی اِبانت نہیں ہے، کیونکہ مشرقی عرب کی بدوی زندگی میں اشیا کا ذخیرہ ہی محدود ہے، اِس لیے یہ بات فطری ہے کہ ایک چیز کے کئی کئی نام ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ مشرقی عرب کی شعری تالیف، قافیہ بندی، الفاظ کا انتخاب اور صوتی آہنگ تو متاثر کرتا ہے، لیکن اُس کا مفہوم وخیال، جنگ وجدال میں غارت گری کی داستان، اپنے مویشی کے جمال کی تحسین، محبوبہ کے مسکن وآثار کی یادیں اور اُس کے وصال کی نوحہ گری کے بیان سے طبعیت کو بوجھل کر دینے والے قصوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اِس زاویے سے عرب شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ پہلو مزید واضح ہو جاتا ہے۔ ہم یہاں دو مثالوں سے اِس فرق کو پیش کرتے ہیں:

پہلے، جود وسخا پر مبنی اُن چند عربی اشعار کو جمع کر کے ترجمہ کیا گیا ہے جو مشرقی عرب کی شعری روایت کے اس پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔

اِس کے مقابل میں، دوسری غزل معروف شاعر سید جعفر الحلی کی ہے۔ اِس کے تقابل سے زبان کی ابانت اور اسلوب کی ندرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ذیل میں اِس کی پہلی مثال ملاحظہ فرمائیں:

أبي أحَدُ الغَيْثَينِ صَعْصَعةُ الّذى

متى تُخلف الجَوْزَاءُ وَالنّجمُ يُمطِر

”میرے والد کی سخاوت کا بادل اُس بادل کی طرح نہیں جو جوزا و نجم کے موسم کے علاوہ نہ برسے۔“

وما یک فی من عیب فإنی

جبان الکلب مهزول الفصیل

''مجھ میں اِس کے سوا اور کیا کمی ہے کہ مہمانوں کی آمد سے کتے بھونکتے رہتے ہیں اور اونٹنیوں کو ضیافت میں ذبح کر کے اُن کے بچے ہی ہمارا سرمایہ ہوتے ہیں۔''

وصاعقة من نصله تنکفی بها

علی أرؤس الأقران خمس سحاب

''اُس کی انگلیاں نہیں، پانچ بادل ہیں، جو دشمنوں پر بجلیاں گراتیں اور دوستوں پر ابرِ کرم برساتی ہیں۔''

طویل النجاد، رفیع العماد، کثیر الرماد إذا ما شتا

''وہ اونچی نیام والا، بلند مکان والا اور کھانے پکانے سے راکھ کے ڈھیر لگانے والا ہے، جب سردی سے لوگ بھوکے ہوں۔''

إن السحاب لتستحیی إذا نظرت

إلی نداک فقاسته بما فیها

''بادل جب تیری سخاوت کو دیکھ کر موازنہ کرتے ہیں تو شرما جاتے ہیں کہ کیا تیری پرواز ہے اور کیا اُن کے پاس ہے۔''

وکنت إذا کف أتتک عدیمة

ترجی نوالا من سحابک بلت

''خالی ہاتھوں کو تیری سخاوت کے بادل تر کر دیتے ہیں۔''

فما جازه جود ولا حل دونه

ولکن یصیر الجود حیث یصیر

''سخاوت تیرا جزوِ لاینفک ہے۔ وہ تجھ سے دور نہیں ہوتی، بلکہ تیرا پیچھا ہی کرتی رہتی ہے۔''

ذیل میں دوسری مثال ملاحظہ فرمائیں:

یا قامة الرشأ المهفهف میلی

بظمأی منک لموضع التقبیل

''اے غزالِ بے پروا، نحیفِ عشق پر متوجہ ہو! میری تڑپ کیا ہے، فقط اک بوسۂ جاناں اور!''

رشاء أطلّ دمی وفی وجناته

وبنانه أثر الدم المطلول

''تجھ غزالِ بے رحم کے فراق میں خونِ جگر ہوا۔ دیکھ لو اُس کے قاتل رخسار اور بے رحم انگشت پر میرے بہتے لہو کے سراغ ہیں۔''

یا قاتلی باللحظ أوّل مرة

أجهز بثانية علی المقتول

''سنو! تمھیں معلوم ہے تمھارے عشق کی پہلی نظر ہی قاتل تھی۔ مگر تمھیں کیا، غم فراق سے چور عاشقوں پر تم ہنوز قہر ڈھاتی ہو۔''

فالظلم منک علیّ غیر مذمم

والصبر منی عنک غیر جمیل

''ہمارے لیے تو تیری بے رخی کا تعلق بھی غنیمت ہے۔ اور اتنی بے اعتنائی کہ تمھیں اِس بے رخی پر ہمارا صبر تک بھی گوارہ نہیں۔''

أتلو صحائف وجنتیک وأنت فی

سکر الصبا لم تدر بالإنجیل

''دل لگانے کے بعد اب ہمارا مقصد حیات اور کچھ نہیں کہ تمھارے صفحاتِ رخسار ہی کی تلاوت کیا کریں، مگر ہماری تلاوت تم خاک سنتی؟ شبابِ حسن کے خمار میں تم تو ہائے، انجیل بھی بھلا بیٹھی۔''

أفهل نظمت لئالئا من أدمعی

سمطین حول رضابک المعسول

''پتا ہے؟ تمھارے آنسو نہیں، لڑیاں ہیں موتیوں کی۔ ایسے ہی ہیروں کو جڑ دیا گیا ہے شہد

جیسے چاشنی لعاب ہونٹوں کے گرد''

أشكو إلى عينيك من سقمي بها

شكوى عليل فى الهوى لعليل

''شکوہ کناں ہوں، مگر تم سے نہیں، تمھارے نشیلے نینوں سے کہ ڈبو ڈالا۔ ہائے کس سے شکوہ کر بیٹھا، وہ نین تو خود ہی علیل ہیں، جنھیں میری تڑپ کا احساس نہیں۔''

فعليک من ليل الصدود شباهة

لكنها فى خصرک المهزول

''ایسی بے اعتنائی روشن دن کو بھی گھٹاٹوپ رات بنا ڈالے۔ کہنے دو مجھے، مجھ سے تعلق تمھارے پتھر جگر کی طرح نحیف ہو چکا ہے۔''

لى حاجة عند البخيل بنيله

ما أصعب الحاجات عند بخيل

''عاشق ہوں میں پر کتنا ناسمجھ کہ اندھیری رات میں ایک خودغرض پر بھروسہ ہے اور کتنا مشکل ہے عشق کا یہ سفر کہ ہم اُس خودغرض سے بھی امید قائم کیے ہوئے ہیں۔''

''اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ اور پیو، اور اسراف نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، اے رسول ان سے کہو، کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دی ہیں۔ کہو، یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی اہل ایمان کے لیے ہیں، اور قیامت کے دن تو خالصتاً انھی کے لیے ہوں گی۔ اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔ اے نبی کہہ دو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے حیائی کے کام، خواہ کھلے ہوں یا چھپے، اور حق تلفی، اور ناحق زیادتی، اور اس بات کو حرام ٹھہرایا ہے کہ تم کسی چیز کو اللہ کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری، اور یہ کہ تم اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔'' (الاعراف 7:33-32)

عظیم الرحمٰن عثمانی

ایک اچھوت پاکستانی

کیا آپ کبھی کسی بے ہنگم ہجوم کا حصہ بنے ہیں؟ جہاں رش ایسا ہو کہ کندھے سے کندھا ٹکراتا ہو۔ کسی کو آپ کی فکر نہ ہو ہر انسان آپ کو دھکا مار کے بس اپنا رستہ بنانے میں دلچسپی رکھتا ہو۔ دائیں جانب والا بائیں جانب جا رہا ہو۔ بائیں جانب والا دائیں جانب آ رہا ہو۔ کوئی غصے سے پھنکار رہا ہو، کوئی آستینیں چڑھائے لڑنے کو تیار ہو اور کوئی اپنا جرم ماننے کے بجائے آپ ہی کو مجرم بنانے کے درپے ہو۔ ایسی صورتحال کا سامنا کم از کم ایک پاکستانی کسی نہ کسی درجے جلوسوں میں، سڑکوں پر، بازاروں میں ضرور کر چکا ہوتا ہے۔ آپ کتنے ہی خوش اخلاق اور تحمل مزاج کیوں نہ ہوں؟ زیادہ دیر نہیں لگتی کہ آپ کی شخصیت پر بھی ایک جھنجھلاہٹ، ایک الجھن اور ایک غصہ حاوی ہو جاتا ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ آپ، آپ نہیں رہتے بلکہ اسی بے ہنگم ہجوم کا ایک بے ہنگم حصہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے میں کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کون غلط ہے اور کون صحیح؟ اپنے سوا سب ہی غلط نظر آنے لگتے ہیں اور حالات اتنے ابتر محسوس ہوتے ہیں کہ ان کے درست ہونے کی کوئی امید رکھنا بھی آپ چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے میں اگر کسی طرح آپ اس ہجوم سے نکل کر کسی بلند کشادہ مقام پر پہنچنے میں دانستہ یا نادانستہ کامیاب ہو جائیں جہاں آپ نسبتاً سکون سے سفر بھی کرنے لگیں اور اس مقام سے ہجوم کا بھی جائزہ لے رہے ہوں۔ اس صورت میں کچھ وقفے کے بعد آپ کے حواس بحال ہو جائیں گے۔ وہی تحمل مزاجی اور خوش اخلاقی واپس لوٹ آئے گی جو آپ کا اصلاً حصہ تھی۔ اب آپ کو ان حماقتوں کا بھی ادراک ہو گا جو آپ نے ہجوم کا حصہ ہوتے ہوئے کی تھیں اور بلندی سے جائزہ لے کر یہ بھی جان پائیں گے کہ اس ہجوم کو کس طرح واپس منظم کیا جائے؟ ہجوم کا حصہ رہ کر جو الجھنیں آپ کو بہت بڑی لگ رہی تھیں، اب وسیع نظر سے ان

کے معمولی ہونے کا احساس ہوگا اور حقیقی مسائل کی جانب نظر مرکوز ہوگی۔ اب آپ کو اس ہجوم میں شامل افراد پر غصہ نہیں آئے گا بلکہ ان کی تکلیف کا احساس کرتے ہوئے ان سے ہمدردی ہوگی۔ یہ احساس ہوگا کہ اس ہجوم میں موجود لوگ میری ہی طرح اچھے لوگ ہیں بس بدنظمی کا شکار ہوکر اپنی ہی اذیت کا سبب بن گئے ہیں۔

ہمیں پسند آئے یا نہ آئے لیکن ہم پاکستانیوں کی کیفیت بحیثیت قوم اسی بے ہنگم ہجوم کی سی ہے اور بیرون ملک مقیم محب وطن پاکستانیوں کی مثال شائد ان افراد کی جو دانستہ یا نادانستہ اس ہجوم سے نکل کر قدرے اونچے یا کشادہ مقام پر آگئے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے مسائل کا ادراک پاکستان میں بیٹھے افراد ہی کر سکتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ گمان ایک درجے تک تو درست ہے مگر مسائل کی بھول بھلیوں سے نکلنے کا راستہ وہ شخص زیادہ بہتر بتا سکتا ہے جو خود ان بھول بھلیوں سے باہر ہو مگر اس کا مشاہدہ بلندی سے کر پا رہا ہو۔ مسلمانوں کی قیادت کے لیے کیوں علامہ اقبال کی نظر کروڑوں کی آبادی والے ہندوستان میں موجود سینکڑوں رہنماؤں کو چھوڑ کر صرف جناح پر جا ٹکی؟ وہ جناح جو ملک چھوڑے بیٹھے تھے؟ مجھ سمیت دیگر محب وطن پاکستانیوں کو جو بیرون ملک اپنی مرضی یا کسی مجبوری کی وجہ سے آباد ہیں، مسلسل یہ طعنہ سننا پڑتا ہے کہ تم کون ہوتے ہو پاکستان کے حالات پر بولنے والے؟ اس کی کسی پالیسی یا نظام پر تنقید کرنے والے؟ شاید وہ افراد یہ چاہتے ہیں کہ ہم سب بھی ان چند پاکستانیوں جیسے ہو جائیں جو خود کو پاکستانی کہلانا ایک گالی تصور کرتے ہیں۔ جنہیں پاکستان کے سود و زیاں سے کوئی غرض نہیں۔ کیوں نہیں سوچتے یہ لوگ؟ کہ ہمارے دل آج بھی پاکستان ہی کے لیے دھڑکتے ہیں۔ آج بھی میز پر ٹائمز میگزین لندن اور جنگ اخبار پاکستان رکھا ہو تو لپک کر جنگ اخبار ہی اٹھاتے ہیں۔ آج بھی ہم پوری دنیا چھوڑ کر پاکستان ہی میں سرمایہ کاری کرتے ہیں، اسی کی زمین پر فلاحی

ادارے قائم کرتے ہیں، اسی کی سیاست وصحافت سے دلچسپی رکھتے ہیں، اسی کی فوج کو اپنی فوج مانتے ہیں، اسی کو کھیل سے لے کر سیاست تک میں سپورٹ کرتے ہیں۔ اگر آپ معاشی اعداد و شمار نکالیں تو بیرون ملک بسے پاکستانی ملکی معیشت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ کیوں آپ مجھے اور میرے جیسے بیرون ملک بسے پاکستانیوں کو اچھوت بنا دینا چاہتے ہیں؟ کیوں آپ میں سے کچھ کی طبیعت ناگفتہ پر یہ گراں گزرتا ہے کہ ایک شخص بیرون ملک میں رہ کر بھی محب وطن ہوسکتا ہے؟ اپنے ملک کے لیے بات کرسکتا ہے؟ کون سا ترقی پذیر یا ترقی یافتہ ملک ایسا ہے جس کے ان گنت شہری دنیا کے دوسرے ملکوں میں آباد نہیں؟ کیا وہ بھی اپنے ان شہریوں کو یونہی ملکی معاملات سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں؟ اور ان کی حب الوطنی پر سوال اٹھاتے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ انہیں مساوی تکریم حاصل ہوا کرتی ہے۔ ضروری ہے کہ ہم پردیس میں بسے پاکستانیوں سے خار کھانے کے بجائے انھیں اپنا سمجھ کر ان کے تجربات وصلاحیتوں سے استفادہ کریں۔

''اور ان مومنوں کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے پیمان کو نہیں توڑتے، اور اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں، اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے، اور ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں، اور ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں، اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں، آخرت کا گھر انہی لوگوں کے لیے ہے، یعنی ایسے باغ جو ان کی ابدی قیام گاہ ہوں گے۔ وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو جو صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے اور ان سے کہیں گے کہ 'تم پر سلامتی ہے، تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہوئے ہو'۔۔۔۔۔ پس کیا ہی خوب ہے یہ آخرت کا گھر!''، (الرعد 13:24-20)

شمائلہ عثمان

نیت

امی میں بہت تھک گئی ہوں۔ پتہ نہیں آپ نے کیسے اتنے رشتے نبھا لیے۔ اتنے بچوں کو پال لیا۔ میں تو تین دن میں تھک گئی۔ آپ تو گھر کی بڑی تھیں، کیسے نندوں اور دیوروں کی شادیوں میں دادی جان کے ساتھ رہیں۔ نانا جان تو بہت امیر آدمی تھےلیکن ابو کی آمدنی تو بہت قلیل تھی۔ ہمارا ددھیال تو بہت بڑا تھا اور جوائنٹ سسٹم پھر آپ کے بھی آٹھ بچے۔ سب کو پڑھایا لکھایا قابل بنایا، دینی اور دنیاوی تربیت کی، پھر سب کی شادیاں کیں۔ اب مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے کتنی تکلیفیں اٹھائیں اور کبھی اظہار تک نہیں کیا۔

آج امی کا فون آیا تو صبا پھٹ پڑی اس کا دل رونے کو چاہ رہا تھا پہلے رمضان سے اس کی چھوٹی نندا اپنے بچوں کے ساتھ حیدرآباد سے اسلام آباد اپنی والدہ اور بھائی کے پاس آئی ہوئی تھی۔ اگرچہ تین سال بعد آئی تھی لیکن عید کر کے جانے کا ارادہ تھا آج تیرہواں روزہ تھا صبا کا ایک ایک دن بھاری ہو رہا تھا۔ سارا روٹین بچوں کی چھٹیوں اور رمضان کی وجہ سے آؤٹ ہو چکا تھا۔ اوپر سے نند کے آنے سے بچے بہت خوش تھے۔ اپنے کزنز کے ساتھ مل کر خوب چھٹیوں کو انجوائے کر رہے تھے۔

وہ دو بجے سے سحری بنانے کے لیے کچن میں لگ جاتی تھی۔ اگرچہ نند اس کے ساتھ مستقل لگی رہتی لیکن ذمے داری تو صبا کی ہی تھی۔ فجر کے بعد چند گھنٹے کی نیند ہوتی پھر ضعیف ساس کے لیے اٹھ کر ان کو ناشتہ دینا، دوپہر کے لیے ان کا پرہیزی کھانا بنانا، پھر جن چھوٹے بچوں کا روزہ نہ ہوتا ان کے کھانے کا انتظام کرنا۔ صبا کی نند صالحہ بہت سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اس نے صبا کی کئی ذمے داریاں اپنے ذمے لے لی تھیں۔ اپنی والدہ کو سنبھالنا، ان کا پرہیزی کھانا بنانا اور ان کو

کھلانا، یہ سب اس نے یہ کہہ کر اپنے ذمے لے لیا تھا کہ یہ نیکی تو دن رات آپ ہی کما رہی ہیں۔ میں تو دور ہوں، اس لیے جب تک میں ہوں مجھے ماں کی خدمت کا موقع دیں۔

صبا ہمیشہ پرتکلف کھانوں اور افطاری کا اہتمام کرتی تھی۔ ہر بچے کی الگ پسند کی افطاری اور کھانا ہوتا تھا جس سے ٹیبل بھر جاتی تھی۔ یہ اس کی نظر میں برکت تھی لیکن یہ سسٹم صالحہ نے آ کر چینج کروا دیا۔ افطاری روزانہ پرتکلف نہ ہونا اور کھانے میں ایک ڈش اور وہی سحری میں۔ شروع میں صبا کو عجیب سا لگا۔ لیکن ایک دو دفعہ ایسا کرنے سے سہولت محسوس ہوئی اور سب سے بڑھ کر اس کے نخریلے بچے صالحہ کے بچوں کے ساتھ مل کر جو ایک چیز بنتی، وہی بغیر کسی شکایت کے کھا لیتے۔ صبا کو احساس ہو رہا تھا کہ جس چیز کو وہ برکت خیال کر رہی تھی وہ تو اصل میں اسراف تھا۔

اب صبا کو یہ سسٹم اچھا تو لگ رہا تھا، لیکن اس کی الجھن اور ذہنی تھکاوٹ کا باعث اس کی ضعیف ساس تھیں جو ہمیشہ سے مشرقی روایتی ساس رہیں تھیں۔ بیماری اور بڑھاپے نے ان کے مزاج میں مزید تلخی پیدا کر دی تھی۔ ان کو اپنی بیٹی کا کام کرنا، سادہ کھانا کھانا؛ اپنی بہو کی لاپرواہی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ روٹین میں صبا کے پرتکلف کھانوں کو دیکھتی رہیں تھیں اور صبا کے میکے والوں کے آنے پر ہونے والے اہتمام بھی ان کے ذہن میں تھے۔ جس کی وجہ سے ماحول میں کھنچاؤ سا پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے صبا بیزار تھی اور آج سارا دکھ ماں سے کہہ ڈالا۔

نفیسہ بیگم بردبار اور سنجیدہ خاتون تھیں۔ انہوں نے صبا کی ایک ایک بات غور سے سنی۔ جب اس کا دل ہلکا ہو گیا تو اپنے روایتی اور پرشفقت انداز میں بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔ صبا! تم سے کس نے کہا کہ میں نے تکلیفوں میں زندگی گزاری۔ اگر نانا جان امیر آدمی تھے تو یہ میری ماں کا نصیب تھا۔ میرا نصیب تو میرے شوہر کے ساتھ جڑا تھا۔ تمہارے بابا کی آمدنی شروع میں قلیل

تھی، لیکن وقت کے ساتھ ان کی محنت میں اللہ تعالیٰ نے برکتیں عطا کی تھیں، تمہاری دادی نے اپنے بچوں کی تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، تمہارے بابا نے جو عزت اور اعتماد مجھے دیا وہی میری زندگی کا سرمایہ تھا، میں نے جو کام بھی کیا اپنے شوہر کی رضا کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جس پر ہمیشہ ان کا اعتماد حاصل رہا۔ سسرال میں عزت ملی اور میں نے بھی ہر کام نیکی سمجھ کر کیا۔ وقت کے ساتھ پختگی آتی گئی اور کمزوریاں دور ہوتی گئیں جو تم سب بہن بھائیوں کی تربیت میں کام آئی۔

بیٹی میرا تو تجربہ ہے کہ اگر ہر ذمے داری اور ہر رشتے کو نیکی سمجھ کر نبھاؤ تو اللہ تعالیٰ بڑا خوش ہوتا ہے۔ برکت بھی ڈالتا ہے اور آسانیاں بھی پیدا کرتا ہے۔ بیٹی تمہارا شوہر تمہیں بہت عزت دیتا ہے۔ تمہاری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے سرگرم رہتا ہے۔ مالی طور پر مستحکم ہے۔ تم پر اعتبار کرتا ہے۔ بیٹی یہ عزت اور اعتبار کا رشتہ محبت سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اگر تم رمضان میں نفلی عبادتوں کے لیے ٹائم نہیں نکال پا رہی تو تم صرف اپنی نیت کو بدلو۔ ہر کام نیکی سمجھ کر کرو۔ گھر کے کام کاج بچوں کی پرورش، مہمان داری، افطاری کرانا، سحری کا انتظام بزرگوں کا خیال ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کرو۔ نفلی عبادات سے زیادہ ان شاء اللہ اجر کی مستحق ہوگی۔ بیٹی تمہاری نند کا آنا تو سراسر رحمت ہے۔ اس نے تمہارے لیے کتنی آسانیاں پیدا کی ہوئی ہیں جو بچوں کی تربیت میں بھی کام آئیں گی۔ رہا ساس کا رویہ تو یہی تلخ و شیریں رشتوں اور رویوں کو نبھا کر ہی جنت کی امیدوار بن سکتی ہو۔

صبا کو اپنی سوچ پر شرمندگی ہو رہی تھی نفیسہ بیگم کی نصیحت نے اس کی اندرونی کیفیت کو بدل دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی اور ہر لمحہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں کا دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی۔ صبا وہی تھی، کام وہی تھے، صرف نیت کے بدل جانے سے رویے بھی بدل گئے اور نتائج بھی۔

بلال الرشید

ڈیزائننگ ہر طرف

جیمز ویب دوربین کے خلا میں جانے کے بعد سے پاکستانی سوشل میڈیا میں بھی سائنس اور ٹیکنالوجی پر بات چیت شروع ہوگئی ہے۔ ایک بڑی تعداد اگرچہ آج بھی یقین رکھتی ہے کہ انسان چاند پہ کبھی نہیں اترا، وہ توسب امریکی ڈرامہ تھا۔ مگر پھر بھی مختلف گروپس میں خلا، سائنس اور کائنات کے بارے میں سوال جواب جاری ہیں۔

سائنسدان جب اس دنیا کو دیکھتے اور اس پہ اپنی رائے دیتے ہیں تو سب سے زیادہ جس چیز کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں' وہ زندگی ہے۔ ایک زندہ چیز ایسا عجوبہ ہے کہ وہ ششدر رہ جاتے ہیں۔ اپنی مشہور دستاویزی فلم into the universe with Stephen Hawking میں ہاکنگ کہتا ہے کہ کائنات' اگر زندگی کو جنم دے سکتی ہے تو وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اصل میں زندہ چیزیں بھی ہائیڈروجن اور کاربن جیسے انھی عناصر سے بنی ہیں' جن سے مردہ چیزیں بنی ہیں۔ ہائیڈروجن' کاربن اور آکسیجن وغیرہ ایک ساتھ کہیں پڑی ہوں' جیسا کہ دنیا میں ہر کہیں یہ عناصر بکھرے ہوئے ہیں تو یہ حیرت کی بات نہیں' لیکن ان میں سے کچھ آپس میں مل کر ایک زندہ چیز کی حیثیت اختیار کر جائیں تو یہ بہت زیادہ حیرت انگیز بات ہے۔

مغربی سائنسدان اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ کائنات اگر زندگی پیدا کر سکتی ہے تو وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ دوسری طرف آپ دیکھیں تو یہ کائنات خود بے جان ہے۔ یہ بات درست ہے کہ سورج نہ ہوتا تو زمین پہ زندگی نہ ہوتی۔ یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ یہ سورج سات لاکھ بیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہا ہے لیکن سورج اور دوسرے ستارے تو خود بے جان ہیں۔ ستارہ ایک بہت بڑی چیز ہوتا ہے' لیکن اس میں دماغ نہیں ہوتا' نروز نہیں ہوتے' خون کی شریانیں نہیں ہوتیں' ہڈیاں' کھوپڑی اور ٹانگیں نہیں ہوتیں۔ بڑے بڑے ستاروں سے لے کر

بلیک ہولز تک سب اجرامِ فلکی انسان کی طرف سے اپنا نام رکھے جانے کے محتاج ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی ستارے نے آنکھیں کھول کر اپنا مدار خود مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔

پھر کائنات کے فیصلے کون کر رہا ہے؟ کبھی کوئی نہیں بتا سکا کہ یہ والا جو ستارہ ہے، یہ عقل رکھتا ہے اور یہ کائنات کے فیصلے کر رہا ہے۔ اسٹیفن ہاکنگ یہ تو کہتا ہے کہ کائنات کچھ بھی کر سکتی ہے، لیکن یہ کائنات ہے کون؟ یہی وہ استدلال ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ وہ سورج چاند اور ستاروں کو دیکھ کر لوگوں کے سامنے سوال اٹھاتے رہے اور توحید پر انھیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ سوال آپ کو خدا تک لے جا سکتا ہے، اگر آپ کی ذاتی انا اور انسانی آزادیوں کے بے کنار ہونے کی خواہش راہ میں حائل نہ ہو۔ تعصّبات جب غالب ہوں تو علوم تک رسائی کے باوجود آپ ہدایت نہیں پا سکتے۔

یہی صورتِ حال سیاروں کی ہے۔ مختلف سیاروں میں مختلف قیمتی عناصر موجود ہیں، لیکن انسان تو کجا، ایک چیونٹی بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ ہر طرف resources بکھرے ہوئے ہیں۔ کوئی انہیں استعمال کرنے والا نہیں؛ حتیٰ کہ کوئی ان عناصر کا نام رکھنے والا بھی نہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ انسان اس قابل ہو گیا کہ وہ چیزوں کے نام رکھنے لگا۔ اس نے جان لیا کہ بے جان چیزوں کی طرح جاندار بھی انھی عناصر سے مل کر بنے ہیں۔

لوگ ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو غلط کہتے ہیں، جس کے تحت چمپینزی اور نی اینڈرتھل مین (Homo Neanderthal) کو انسان کا فرسٹ کزن مانا جا سکتا ہے؛ حالانکہ حیاتیاتی طور پر انسان اور بھینس میں بھی کوئی خاص فرق نہیں۔ جلد سے لے کر گردے، پھیپھڑے اور دل تک، سبھی کچھ انھی اصولوں پہ کام کر رہا ہے، اسی طرح کی آنتیں ہیں، اسی طرح کا جگر۔ ڈارون نے اس کے سوا اور کچھ بھی observe نہیں کیا کہ زمین کے بدلتے ہوئے حالات میں زندہ چیزوں میں تبدیلیاں پیدا ہوتی رہیں (اور حتیٰ کہ انسان وجود میں آ گیا)۔

لیکن دوسری طرف انسان؛ چونکہ ہر چیز کی گہرائی میں اتر جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ خوردبین کے عدسوں سے ایک ایک خلیے کو بھی چھان پھٹک چکا ہے‘ تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ آخری درجے کی نفاست کے ساتھ کسی نے ہمیں ڈیزائن کیا ہے۔ بخوبی دیکھا جا سکتا ہے کہ کسی نے جانداروں کے جسم میں nerves بچھائیں‘ تاکہ اس کے ایک ایک حصے میں ذرا برابر تکلیف؛ حتیٰ کہ چیونٹی کے کاٹنے کا درد بھی پلک جھپکنے میں دماغ تک پہنچے۔ یہی صورتِ حال زخم لگنے کی ہے۔ جیسے ہی زخم لگتا اور خون رستا ہے‘ ایک نظام متحرک ہوتا ہے اور خون خود ہی جم کر زخم کا منہ بند کر دیتا ہے۔ یہی صورتِ حال دماغ کے بلڈ برین بیریئر میں ہے۔ اس سسٹم کے تحت سختی اور باریکی کے ساتھ خون کو چھان کر انتہائی ضروری مواد ہی دماغ تک جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ ڈیزائننگ ہر طرف ہے۔ ایک گرافک ڈیزائنر سے کہیں کہ آپ کی تصویر میں منہ اوپر اور ناک نیچے کر دے۔ آپ کی زندہ رہنے کی صلاحیت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوگا لیکن چہرہ انتہائی بھیانک ہو جائے گا۔ کوئی تھا کہ جو خوبصورتی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ انسان جو اپنے دل کی دھڑکن خود کنٹرول نہیں کر رہا‘ وہ اپنی آنتوں میں سے غذا کے اخراج کو ایک دو گھنٹوں کیلئے بخوبی روک سکتا ہے‘ ورنہ کتنی شرمندگی ہوتی۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ کہ اربوں چہروں میں ایک ہی جیسی 14 ہڈیاں، 43 مسلز اور ایک جیسی جلد موجود ہے۔ اس کے باوجود ہر چہرہ دوسرے سے مختلف ہے۔

اور یہی نہیں‘ ہر ایک کی انگلیوں کے نشان مختلف ہیں۔ بعض اوقات انسان حیرت میں ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ ڈیزائننگ ہر طرف ہے۔ جو لوگ کائنات اور کرہ ارض کی ڈیزائننگ کو سمجھ رہے ہیں، وہ سائنسی طور پر ہم سے کہیں آگے ہیں۔ بہرحال اب امید کی جا سکتی ہے کہ کہیں سے ہم نے آغاز تو کیا۔

[بشکریہ: روزنامہ جنگ]

ڈاکٹر ریحان احمد یوسفی (ابویحییٰ)

برصغیر اور دعوت دین کا طریقہ کار (7)

الجہاد فی الاسلام کے مضامین کا ایک اجمالی جائزہ

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب متعدد ذیلی مباحث میں تقسیم ہے۔

پہلا باب اسلامی جہاد کی حقیقت کے عنوان سے ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک ایسے دور میں جب دنیا بھر میں انسانی جان بے وقعت تھی اسلام نے انسانی جان کی حرمت کو سب سے بڑی قدر کے طور پر بیان کیا اور قتل انسان کو عظیم گناہ اور بڑا جرم قرار دیا ہے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ بعض مواقع پر یہ اجازت دی گئی ہے کہ انسانی جان کی یہ حرمت ختم کر دی جائے۔ ایسا نہ کیا جاتا تو جرائم کا راستہ روکنا ممکن نہ تھا۔ پھر یہیں سے یہ بات اٹھائی گئی ہے کہ انفرادی مجرموں کی طرح اقوام بھی ایسے جرائم کی مرتکب ہوتی ہیں جن کی سزا نہ دی جائے تو زمین میں فساد پھیل جائے گا۔ چنانچہ ان حالات میں جنگ ایک مقدس دینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔

دوسرے باب کا عنوان مدافعانہ جنگ ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جنگ کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جس کا مقصد دفاعی ہوتا ہے اور اس پس منظر میں مختلف وجوہات جیسے حفاظت دیار یا حفاظت دین کے لیے جنگ کرنا فرض ہے۔ اسی طرح اس باب میں دفاعی جنگ کی دیگر شکلوں کا احاطہ کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ بدی اندر سے حملہ آور ہو یا باہر سے اسے کچلنا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔

تیسرے باب کا عنوان مصلحانہ جنگ ہے۔ اس باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ایک ایسے گروہ کے طور پر دنیا میں مبعوث کیا گیا ہے جس کا کام ہی لوگوں کو نیکی کی دعوت دینا اور برائی سے روکنا ہے۔ ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ نیکی کی اس دعوت اور برائی کے خاتمے کا کام اپنے اندر

بھی کریں اور خارج میں پوری دنیا میں بھی کریں۔ نیکی کا حکم تو صرف دعوت و تبلیغ سے پورا ہو سکتا ہے لیکن نھی عن المنکر کے لیے زبانی تلقین کے ساتھ قوت بھی استعمال کرنا ہوگی۔ یہی جہاد کے اس حکم کا ماخذ ہے جس میں فتنہ وفساد کو ختم کرنے کے لیے قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ جنگ دوسری اقوام کی طرح ہوس ملک گیری کی جنگ نہیں بلکہ دنیا میں فساد ختم کر کے ایک عادلانہ نظام قائم کرنے کی جنگ ہے۔ یہی وہ مصلحانہ جنگ ہے جو صحابہ کرام نے روم و فارس کی سلطنتوں کے خلاف کی اور ان کو بے دخل کر کے ایک انتہائی منصفانہ اور عادلانہ نظام قائم کر دیا تھا۔

چوتھے باب کا عنوان اشاعت اسلام اور تلوار ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس باب میں اس الزام کا جواب دیا گیا ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا۔ چنانچہ مصنف نے یہ بتایا ہے کہ اسلام میں جہاد کا مقصد لوگوں کو ظلم وفساد سے روکنا ہے ان کا مذہب بدلنا نہیں۔ اس معاملے میں دین کی اصولی ہدایت کا بنیادی حکم لا اکراہ فی الدین (البقرہ ۲:۲۵۶) ہے۔ پھر قرآن مجید کی روشنی میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ دین ایک دعوت ہے کوئی جبر نہیں ہے۔ خدا کی اسکیم میں جبر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اسلام بہت سے جرائم کی سخت سزا مقرر کرتا ہے۔ اسی طرح تلوار استعمال کر کے اس نظام باطل کو ضرور ختم کیا جاتا ہے جو برائیوں کی طرف بلاتا، ابھارتا اور انھیں آسان بناتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ فتح مکہ کے بعد پورا عرب اور روم و ایران کی فتح کے بعد وہاں کے رہنے والوں نے تیزی سے اسلام قبول کر لیا۔

پانچویں باب کا موضوع اسلامی قوانین صلح و جنگ ہے۔ اس باب میں مصنف نے جہاد و قتال کے حوالے سے اسلام کے قوانین کو بیان کیا ہے۔ آغاز میں اہل عرب کے تصور جنگ، جنگی محرکات، اور جنگی جرائم کا تفصیلی بیان ہے۔ اس کے بعد جنگ کے بارے میں ایسی ہی ظالمانہ روایات جو روم و ایران میں عام تھیں ان کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ اسلام

نے ان مروجہ جنگی جرائم کو نہ صرف ختم کیا بلکہ جنگوں کو اخلاقی حدود کا تابع رکھنے کے لیے خود متعدد نئے قوانین متعارف کروائے۔ آخر میں سیرت سے متعلق ان بعض تاریخی واقعات کی وضاحت ہے جن پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ باب کے آخر میں مصنف نے یہ توجہ دلائی ہے کہ زمانہ جدید کی تبدیلیوں کے بعد ہمارے قانون میں دور جدید کی رعایت سے کچھ اضافوں کی ضرورت بھی ہے۔

چھٹے باب کا عنوان ''جنگ دوسرے مذاہب میں'' ہے۔ اس باب میں مصنف نے دنیا کے چار بڑے مذاہب، ہندومت، بدھ مت، یہودیت اور مسیحیت کا جائزہ لیا ہے۔ مگر اس سے قبل وہ اصول واضح کیے ہیں جن کی بنا پر دوسرے مذاہب کا دیانتدارانہ مطالعہ کرنا ممکن ہوتا ہے۔ پہلے انھوں نے ہندو دھرم کی تین بنیادی ماخذوں یعنی ویدوں، بھگوت گیتا اور منو کی دھرم شاستر کی روشنی میں یہ واضح کیا ہے کہ ان کے پیش نظر مال و دولت اور علاقوں پر قبضہ کرنے کے علاوہ جنگ کا کوئی بلند تر مقصد نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے اخلاقی ضابطے بھی غیر مثالی اور مفتوحوں کے لیے باعث تذلیل ہیں۔ شودر جو ہندو دھرم میں سب سے نچلا طبقہ تھا وہ دراصل مقامی مفتوح قوم ہی تھی۔ اس کے بعد یہودیت کے قوانین جنگ زیر بحث آتے ہیں۔ مگر ان کے قوانین کا مقصد بھی مصنف کے نزدیک ملک گیری ہے۔

اس کے بعد مصنف نے دو ایسے مذاہب کی تعلیمات کا مطالعہ پیش کیا ہے جو جنگ ہی کے خلاف تھے۔ پہلا بدھ مت جس کے متعلق مصنف نے یہ واضح کیا کہ اس کی بنیادی تعلیم ہی ترک دنیا تھی، اس لیے اس میں قوانین جنگ کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ دوسرا مذہب مسیحیت ہے۔ اس کے متعلق مصنف نے واضح کیا کہ یہ کوئی مستقل مذہب نہ تھا، بلکہ یہودیت کی ایک اصلاحی تحریک تھی۔ مگر سینٹ پال نے موسوی شریعت کو الگ کر کے اسے ایک عالمی مذہب بنا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا

کہ مسیحیت کے پاس کوئی ایسا قانون ہی نہیں بچا جس کی بنیاد پر ان کا اپنا کوئی قانون جنگ وجود میں آتا۔ چنانچہ مسیحی حضرات نے تاریخ میں جو کچھ کیا وہ ان کی اپنی خواہشات سے بنایا ہوا نظام تھا جو ظلم وتعدی پر مبنی تھا۔

ساتویں اور آخری باب کا عنوان، جنگ تہذیب جدید میں، ہے جس میں موجودہ تہذیب کے قوانین جنگ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے پہلی جنگ عظیم کو بنیاد بنا کر یہ بتایا ہے کہ موجودہ تہذیب میں جنگ کا اصل مقصد ہوس ملک گیری کے سوا کچھ نہیں جس کا مظاہرہ پہلی جنگ عظیم میں ہوا۔ اسی طرح جو قوانین جنگ بنائے گئے، ان میں نمائشی طور پر تہذیب اور ضابطوں کی بات تو کی گئی مگر عملی طور پر جو خونریزی، جان، مال اور آبرو کا اتلاف پہلی جنگ عظیم میں ہوا، وہ اس بات کا گواہ ہے کہ یہ سارے قوانین نمائشی تھے۔ باقی جو کچھ قوانین بنائے بھی گئے ہیں وہ کسی طور اسلامی قوانین سے بہتر یا برتر نہیں ہیں۔

حیدرآباد دکن میں منتقلی اور تصنیفات کا سلسلہ

مئی ۱۹۲۸ء میں مولانا مودودی نے الجمیعہ کی ادارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد وہ چند ماہ تک دہلی میں رہے اور اسی عرصے میں اکتوبر ۱۹۲۸ء میں ''دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ، سیاسی تعلقات کی تاریخ پر ایک نظر'' کے عنوان سے کتاب مرتب کی۔ یہ آپ کے ان مضامین کا مجموعہ تھا جو الجمیعہ کی ادارت کے زمانے میں شائع ہوئے تھے۔ اسی برس دسمبر میں آپ حیدرآباد دکن میں منتقل ہو گئے۔ یہاں بھی آپ نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا اور ''دکن کی سیاسی تاریخ'' کے علاوہ سلاجقہ حکمرانوں کی تاریخ پر بھی ایک کتاب تصنیف کی۔ اسی زمانے میں نواب سالار جنگ کی خواہش پر ''ممالک محروسہ سرکار عالی میں تبلیغ اسلام کی ایک اسکیم'' کے عنوان سے حیدرآباد دکن میں فروغ اسلام کے لیے ایک منصوبہ بنایا۔ اس کے علاوہ

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے لیے مولانا صدرالدین شیرازی کی ایک فلسفیانہ کتاب اسفار اربعہ کے حصہ دوم کا ترجمہ بھی کیا۔ مگر اس زمانے کی آپ کی سب سے مشہور تصنیف رسالہ دینیات ہے جو مدرسہ فوقانیہ دینیات کے نصاب کے لیے لکھی گئی اور آج بھی مولانا کی سب سے زیادہ شائع اور ترجمہ ہونے والی کتاب ہے۔

ترجمان القرآن کا آغاز

اسی زمانہ میں مولانا مودودی تحریک عالمگیر قرآن مجید سے وابستہ ہو گئے جس کے روح رواں ابومحمد صالح تھے۔ ترجمان القرآن جو بعد میں مولانا مودودی کی شناخت بنا، انھی کا رسالہ تھا۔ ترجمان القرآن کا آغاز رجب المرجب ۱۳۵۱ھ بمطابق اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ابومحمد صالح نے حیدرآباد دکن سے کیا۔ اس کے ابتدائی چھ پرچے انھی کی ادارت میں شائع ہوئے۔ اس دوران میں مولانا مودودی نے اس میں مضامین بھی لکھے۔ تاہم ابومحمد صالح بوجوہ اس سلسلے کو جاری نہیں رکھ سکے اور اس کے بعد سے اس رسالے کی ملکیت اور ادارت مولانا مودودی نے سنبھالی۔ محرم ۱۳۵۲ھ مطابق اپریل ۱۹۳۳ء میں ان کی ادارت میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ ابتدائی کچھ عرصے تک اس کا ڈیکلیریشن مولانا ابومحمد صالح کے نام رہا مگر بعد ازاں اسے مولانا نے اپنے نام کرا لیا۔

ترجمان القرآن آنے والے دنوں میں نہ صرف مولانا مودودی کی زندگی کا سب سے بڑا مشن بن گیا بلکہ ان کی تمام فکر و نظریات کی اشاعت کا بنیادی ذریعہ بھی بن گیا۔ ان کی بیشتر تصانیف پہلی دفعہ اسی رسالے میں شائع ہوئیں اور بعد میں کتاب کی صورت میں شائع کی گئیں۔ یہ رسالہ ان کی وفات (ستمبر ۱۹۷۹) تک باقاعدگی سے جاری رہا بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی آج کے دن تک جاری ہے۔ تاہم اپریل ۱۹۳۳ء سے لے کر اگست ۱۹۴۱ء تک جب مولانا

مودودی نے اپنی فکر کی بنیاد پر معاشرے میں عملی تبدیلی کے لیے جماعت اسلامی کے نام سے ایک باقاعدہ جماعت قائم کی، یہ رسالہ اس فکر کے آغاز، استدلال اور ابلاغ کا بنیادی اور واحد ذریعہ بنا رہا جسے احیائے اسلام کی فکر کہا جاتا ہے اور جس کا مقصد زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی شعبوں اور بالخصوص نظام حکومت کو اسلام کے مطابق ڈھال کر اسلام کو ان پر غالب کرنا ہے۔

احیائے اسلام کے لیے عملی جدوجہد سے قبل ترجمان القرآن کے تین تصنیفی ادوار

ترجمان القرآن کے آغاز سے لے کر جماعت اسلامی کے قیام تک مولانا مودودی کی فکری زندگی کے یہ آٹھ اہم ترین برس ہیں۔ان کو ہم ان تصنیفات جو ان کے فکری ارتقا کی بھی آئینہ دار ہیں کے لحاظ سے مجموعی طور پر تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۳۷ء کا ہے جس میں زیادہ تر مولانا مودودی نے ان امور پر لکھا جن کا تعلق اسلام کی شرح و وضاحت، مغربی تہذیب کے اثر سے پیدا ہونے والے بعض مسائل اور چیلنجز کے جواب میں اسلامی نقطہ نظر کے بیان سے ہے۔ مثلاً اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی (اشاعت ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴)، مسئلہ جبر وقدر (اشاعت ۱۹۳۳)، مسئلہ فلسفہ ملکیت زمین (اشاعت ۱۹۳۳)، اسلام اور ضبط ولادت (اشاعت ۱۹۳۵)، حقوق الزوجین (اشاعت ۱۹۳۵ تا ۱۹۳۶)، اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر (اشاعت ۱۹۳۵)، قرآن و حدیث (اشاعت ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۵)، پردہ (اشاعت ۱۹۳۵ تا ۱۹۳۶)، سود (اشاعت ۱۹۳۷)، تنقیحات (اشاعت ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۷)، تفہیمات حصہ اول (اشاعت ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۷)، تفہیمات حصہ دوم (اشاعت بیشتر مضامین ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۷) وغیرہ۔ یہ وہ تصانیف ہیں جو ابتدا میں مضامین کی شکل میں مذکورہ بالا تاریخوں میں ترجمان القرآن میں شائع ہوئیں۔

دوسرا دور ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۹ء کا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں ۱۹۳۷ء کے الیکشن اور اس کے بعد کے زمانے میں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ مسلمان متحدہ ہندوستانی قومیت کا حصہ ہیں یا ایک الگ مسلم قوم ہیں۔ اس زمانے میں لکھی گئی تصانیف میں مسئلہ قومیت (اشاعت ۱۹۳۸)، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ اول (اشاعت ۱۹۳۷)، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ دوم (اشاعت ۱۹۳۷ تا ۱۹۳۸) نمایاں ہیں۔ یہ کتابیں بعد میں یکجا کر کے تحریک آزادی ہند اور مسلمان حصہ اول کے نام سے شائع ہوئیں۔ مگر جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ اُس وقت برصغیر میں بپا ہندو مسلم سیاسی کشمکش میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے لکھی گئیں۔ ان کتابوں کا مرکزی خیال متحدہ ہندی قومیت کے اس نظریے کی نفی تھا جو کانگریس کے اثر سے مسلمانوں کے ایک بڑے حصے کو متاثر کر چکا تھا اور خاص کر علماء کا طبقہ جس کا علمبردار تھا۔ مولانا نے مذہبی اساس پر اس نظریے کی شدت سے نفی کی۔

تیسرا دور ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۱ء پر مشتمل ہے۔ جماعت اسلامی کے قیام سے قبل کا یہ وہ دور ہے جس میں مولانا مودودی نے احیائے دین کے اپنے فلسفے کی علمی اور فکری اساسات قرآن مجید اور مسلمانوں کی تاریخ کی روشنی میں بیان کیں۔ اس دور کی تین بنیادی کتابیں اس حوالے سے مولانا کی فکر کو سمجھنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ پہلی مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم (اشاعت ۱۹۳۹ تا ۱۹۴۱) جو بعد میں تحریک آزادی ہند اور مسلمان حصہ دوم کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کا مقصد نسلی اسلام کی بنیاد پر مسلم قومیت کے نظریہ کی نفی تھا اور اس تصور کی وضاحت تھی کہ اسلام ایک فکری تحریک ہے اور جو شخص شعوری طور پر اسلام کو اختیار کرے وہی مسلم قومیت کا حصہ ہے نہ کہ پیدائشی اور نسلی بنیاد پر پیدا ہو جانے والے لوگ جن کا عمل اسلام کے اصولوں کے بالکل برخلاف ہے۔ دوسری تجدید و احیائے دین (اشاعت ۱۹۴۰) جس میں

تاریخی تناظر میں اسلام اور جاہلیت کی کشمکش کی تفصیل کا بیان ہے۔ اور تیسری قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں (اشاعت ۱۹۴۱) جس میں قرآن مجید کی بنیاد پر حکومت الٰہیہ کے نظریے کی فکری اساس کا بیان ہے۔

کتابوں کی اس زمانی ترتیب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ احیائے اسلام کی فکر کی وہ اساسات جو ۱۹۲۷ء میں الجہاد فی الاسلام میں بہت ابتدائی سطح پر مصلحانہ جنگ کے ذیل میں نظر آئیں تھیں، انھوں نے بتدریج اپنا ظہور کیا۔ پہلے مولانا مودودی نے اسلام کی تہذیب و مذہب کی شرح و وضاحت اور دفاع کے لیے قلم اٹھایا تاکہ جدید نسل کے ذہن سے مغربی تہذیب سے مرعوبیت کا جو ذہن پیدا ہو رہا تھا، اس کی روک تھام کی جا سکے۔ اس کے بعد دوسرے دور میں ہندو مسلم سیاسی کشمکش میں ایک طرف متحدہ قومیت کے نظریے کی نفی کی اور دوسری طرف نسل یا وطن کی بنیاد پر قوم کے بجائے مذہبی بنیاد پر مسلم قومیت کے حق میں استدلال کیا۔ دین اسلام کی وضاحت اور مسلم قومیت کی اساسات کی درست تعیین کے بعد عملی جدوجہد کے میدان میں اترنے سے قبل قرآن مجید اور تاریخ کی روشنی میں احیائے اسلام کی فکری اور علمی اساسات کو پوری طرح پیش کیا۔ ساتھ ہی یہ بتایا کہ اسلام ایک نسلی قومیت نہیں ایک اصولی دین ہے اور اس کے پیدا کردہ لوگ کسی خاص نسل کا حصہ نہیں بلکہ اسلام کے اصولوں کو شعوری طور پر اختیار کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔

مولانا مودودی کے تخلیق کردہ اس تصنیفی لٹریچر کی طاقت یہ ہے کہ ان سے علمی طور پر اختلاف رکھنے والے گروہوں نے بھی آنے والے برسوں میں ان ہی کے پیش کردہ فکری تصورات کو قبول کیا اور احیائے اسلام کے لیے قائم کی جانے والی جماعتیں چاہے وہ سیاسی میدانوں میں فعال ہوئیں یا انقلابی طریقہ اختیار کیا، انھی کی فکر کی خوشہ چین ہیں۔

پروین سلطانہ حناؔ

اللہ رفیق اعلی

میری ماں ! اے بہت ہی پیاری ماں
جب سے تجھ سے جدا ہوئی ہوں میں
بڑی مشکل میں آ گئی ہوں میں
تیری شفقت کی اب وہ چھاؤں نہیں
تیرے قدموں میں میری جنت تھی
دسترس میں میری وہ پاؤں نہیں
جب تلک تھا تیری دعا کا حصار
تھا بہت دور مجھ سے غم کا غبار
جب سے تو ہو گئی جدا مجھ سے
غم نے تو گھر کا رستہ دیکھ لیا
بن تیرے میں نے جینا سیکھ لیا
تیرا ہر نقش یاد ہے مجھ کو
تیرے لفظوں کا پاس ہے مجھ کو
تو نے ہی تو کہا تھا یہ مجھ سے
میں رہوں، نہ رہوں جو دنیا میں
خود کو تنہا کبھی نہیں کہنا

ہم اکیلے کبھی جو ہوتے ہیں
ہم اکیلے کبھی نہیں ہوتے
اس کی رحمت جو ساتھ ہو اپنے
درد و غم ہم سے دور رہتے ہیں
کیونکہ سانسوں کے ساتھ ہے اللہ
کیونکہ ہر لمحہ پاس ہے اللہ
ظلمتوں میں وہی اجالا ہے
اس کی شفقت نے ہم کو پالا ہے
وہ یقیناً رفیقِ اعلیٰ ہے

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

فون: 0332-3051201
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ماہنامہ

اِنذار

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوایئے۔اپنے کسی عزیز،دوست،ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

فی کاپی سالانہ سبسکرپشن چارجز: (بذریعہ رجسٹری) صرف 1000 روپے

ایجنسی ڈسکاؤنٹ 20 فیصد ہے۔ ایجنسی ڈسکاؤنٹ کے لیے کم از کم ہر ماہ پانچ رسالے لینا ضروری ہے۔

سبسکرپشن چارجز مندرجہ ذیل پر ارسال کریں	
Easy Paisa	Muhammad Shafiq 0334-3799503 CNIC # 42201-8355292-9
Money Order	Monthly Inzaar 4th Floor Snowhite Centre Abdullah Haroon Road Opp. Hotel Jabees Saddar Karachi
Account	Title of Account: Monthly Inzaar A/C # 0171-1003-729378 Bank Al Falah Saddar Branch Karachi.

آپ سے درخواست ہے کہ سبسکرپشن چارجز بھیجنے کے بعد اپنے نام اور موبائل نمبر کے ساتھ نیچے دیے ہوئے نمبر پر کال یا SMS ضرور کریں تاکہ آپ کے رسالے کی سبسکرپشن کی جا سکے۔مزید معلومات کے لیے ان نمبرز پر رابطہ کریں۔شکریہ

0332-3051201

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے

2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوایئے

3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

فون: 0332-3051201
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ماہنامہ انذار

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوائیے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

فی کاپی سالانہ سبسکرپشن چارجز: (بذریعہ رجسٹری) صرف 1000 روپے

ایجنسی ڈسکاؤنٹ 20 فیصد ہے۔ ایجنسی ڈسکاؤنٹ کے لیے کم از کم ہر ماہ پانچ رسالے لینا ضروری ہے۔

سبسکرپشن چارجز مندرجہ ذیل پر ارسال کریں	
Easy Paisa	Muhammad Shafiq 0334-3799503 CNIC # 42201-8355292-9
Money Order	Monthly Inzaar 4th Floor Snowhite Centre Abdullah Haroon Road Opp. Hotel Jabees Saddar Karachi
Account	Title of Account: Monthly Inzaar A/C # 0171-1003-729378 Bank Al Falah Saddar Branch Karachi.

آپ سے درخواست ہے کہ سبسکرپشن چارجز بھیجنے کے بعد اپنے نام اور موبائل نمبر کے ساتھ نیچے دیے ہوئے نمبر پر کال یا SMS ضرور کریں تاکہ آپ کے رسالے کی سبسکرپشن کی جا سکے۔ مزید معلومات کے لیے ان نمبرز پر رابطہ کریں۔ شکریہ

0332-3051201

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے

2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوائیے

3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

”ادھوری کہانی“

ابو یحییٰ کا نیا ناول شائع ہو گیا ہے

☆ ’جب زندگی شروع ہوگی‘ سے شروع ہونے والی کہانی کا اختتام

☆ ایک ایسی داستان جو ہر دکھی دل کو امید کی روشنی سے منور کر دے گی

☆ ایک ایسی لڑکی کا قصہ جسے زندگی نے غموں کے سوا کچھ نہ دیا

☆ ایک ایسے شخص کی حکایت جس نے خدا کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیا

☆ انسان کے ماضی کا وہ بیان جو بہت سے سوالات کا جواب ہے

☆ جنت کی زندگی کا وہ نقشہ جو آپ نے پہلے کبھی نہیں پڑھا

☆ نبیوں کی اس جنگ کی تفصیل جو نبیوں کے بغیر لڑی گئی

☆ وہ کتاب جو ہر قاری کے دل اور دماغ پر ایک ساتھ دستک دے گی

قیمت 500 روپے

رسالے کے قارئین رعایت کے ساتھ گھر بیٹھے حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں:

رابطہ : 0332-3051201

ای میل: globalinzaar@gmail.com

web: www.inzaar.pk

Monthly
INZAAR
NOV 2022
Vol. 10, No. 11
Regd. No. MC-1380
Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,
25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi

ابویحییٰ کی دیگر کتابیں

''ملاقات''

اہم علمی، اصلاحی اجتماعی معاملات پر ابویحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب
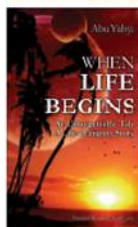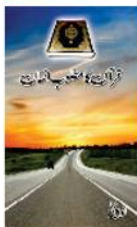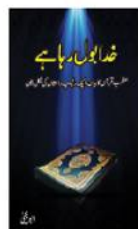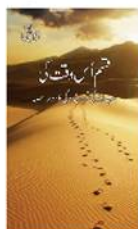
''کھول آنکھ زمیں دیکھ''

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

''جب زندگی شروع ہوگی''

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

''بس یہی دل''

دل کو چھو لینے والے مضامین   ذہن کو روشن کر دینے والی تحریریں

''قسم اُس وقت کی''

ابویحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

''تیسری روشنی''

نفرت اور تعصب کے اندھیروں کے خلاف روشنی کا جہاد

"When Life Begins"

English Translation of Abu Yahya Famous book

Jab ZindagiShuruHo Gee

''حدیثِ دل''

موثر انداز میں لکھے گئے علمی، فکری اور تذکیری مضامین کا مجموعہ

''قرآن کا مطلوب انسان''

قرآن کے الفاظ اور احادیث کی روشنی میں جانیے اللہ ہم سے کیا چاہتے ہیں